تیسرا باب

احوالِ گزشتہ

"A.S"

اور اسکے نیچے کمپنی کا لوگو

مقدم کو یاد تھا کہ آج سے ایک ہفتہ قبل، اُس نے اپنے کلائنٹ کی کلائی میں ایسی ہی گھڑی دیکھی تھی اور اسکے ڈائل پر ایسے ہی الفاظ اور لوگو اوپر نیچے تھے۔ وہ ایک کسٹمائز (خود ساختہ) گھڑی تھی۔ اور جس برانڈ کی تھی، اُسی برانڈ سے مقدم نے اپنے ملازمین کے لیے فرم کے لوگو والی گھڑیاں بنوائیں تھیں۔ اسکو یاد تھا کہ جب، اُس روز اسکی نظریں اپنے کلائنٹ کے ہاتھوں میں سجی اس گھڑی پر پڑی تھیں، تو اس نے چند سیکنڈ کے لئے اُسے غور سے دیکھا تھا۔ یہ اُسکی عادت تھی کہ وہ اپنے پسندیدہ برانڈ کی کوئی نئی کلیکشن یا مصنوعات کسی دوسرے کے پاس بھی دیکھتا، تو چند سیکنڈ کے لئے غور ضرور کرتا تھا۔ یہ کسٹمائز گھڑیاں، برانڈ صرف مخصوص گاہکوں کے لیے ہی بناتا تھا اور اُسے کسی دوسرے گاہک کو نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر اُسکے کے پاس آنے والا شخص اور علی ایک ہی تھے، تو اس حساب سے علی ہی اس کمپنی کا مالک تھا۔ وہ کڑی سے کڑی ملا رہا تھا۔

اُسے یاد آیا کہ جب اُس کی ٹیم نے اُس کلائنٹ کا کام کر دیا تھا، تو انکی جانب سے ایک رسمی سا شکریہ کا خط موصول ہوا تھا۔ جو اس نے بنا پڑھے ہی رکھ دیا تھا۔ ایسے خطوط اُسے سال میں پچاس جگہوں سے آتے تھے، اُسکے پاس اُنہیں پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا تھا۔

"یقیناً اس میں مالک کا نام ہو گا" اس نے سوچا اور موبائل باہر نکالا۔ وہ لیٹر اُسکے ای میل پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس نے میل باکس کھولا، ہزاروں کی تعداد میں میلز پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے پچھلے ہفتے کی تاریخوں میں آنے والی میلز کا جائزہ لیا تو اُسے وہاں شکریہ کا ایک پیغام مل گیا۔ اس نے میل کھولی اور سیدھا پیغام کی آخری سطر پر گیا، جہاں کمپنی کے مالکان کا نام تھا۔

''عمر حفیظ اور علی سفیر''اس نے دل میں دہرایا، نام کے نیچے دونوں کے دستخط تھے۔ حیرت کا شدید جھٹکا تھا جو اُس لمحے اُسے لگا تھا۔ وہ دونوں اُسکے آفس آئے، اس سے بات کی اور چلے گئے۔اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا لیکن مقدم پھر بھی اُنہیں پہچان نہ پایا؟

کیا ہو گیا تھا اُسکی یاداشت کو؟ وہ دونوں بے شک چہرے پر ماسک لگائے ہوئے تھے، پر کیا وہ دس سالوں میں انکی آواز بھی بھول گیا تھا؟ اب اُسے یاد آرہا تھا سب کچھ۔۔۔ کیوں اُسے عمر کی آنکھیں جانی پہچانی لگ رہی تھیں؟ اور کیوں عمر اتنا خاموش سا بیٹھا تھا؟ وہ بھی یقیناً مقدم کو اس طرح اچانک، سامنے دیکھ حیران رہ گیا تھا۔

''لیکن اُن دونوں نے مجھ سے شناسائی ظاہر کیوں نہ کی؟''اس نے چہرہ اٹھا کر ایک بار پھر، ایک نظر اُن دونوں کو دیکھا۔ دونوں ہی لاتعلق سے بیٹھے تھے۔

''میرے چہرے پر تو کوئی ماسک نہ تھا۔ تم دونوں تو مجھے پہچانتے تھے؟ تم دونوں نے مجھ سے شناسائی ظاہر کیوں نہ کی؟ ایک بار۔۔ بس ایک بار، میرا نام ہی لے کر یاد کروا دیتے مجھے۔ میں نہ پہچانتا تو کہتے، میں تو بخوشی اپنے دوستوں سے ملتا، پر تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا جان کر مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے؟ تو پھر آج کیوں مجھ سے سلام دعا کی؟ بتانا تک گوارا نہ کیا کہ پہلے مل چکے ہو مجھ سے'' وہ دل ہی دل میں ڈھیروں شکوے کر چکا تھا۔

''ٹھیک ہے! اگر مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، تو مجھے بھی کسی کی ضرورت نہیں۔ جہاں دس سال اکیلے گزار لیے ہیں، وہاں باقی زندگی بھی گزر جائیگی''اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی انہی کی طرح غیر شناسا بن جائیگا۔ لیکن کیوں؟ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ کیا ہو گیا تھا اُن سب کو؟

وہ لب بھینچے فرش پر کسی نادیدہ نقطے کو تلاش کرنے لگا۔ فرش کے چمکتے ٹائلز پر مختلف مناظر بنتے جا رہے تھے۔ اور وہ سب، ایک بار پھر انہی مناظر کا حصہ بن گئے۔

---------+---------+---------

سترہ سال پہلے:

یہ علی کے انٹر کے امتحانات کے بعد کی بات تھی۔

''کیا سوچا تم نے ؟''اس دن بہت عرصے بعد اُسکی اپنے باپ سے ملاقات ہوئی تھی، ورنہ ایک ماہ سے وہ اپنے انٹر میڈیٹ کے امتحانات میں مصروف تھا۔

''کس بارے میں ؟'' وہ حیران ہوا۔

''آگے کیا کرنا ہے ؟بی بی اے یا بی کام ؟''

''ابّا! میں آپکو کچھ بتانا چاہتا ہوں''اس نے کچھ جھجھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ! کہو''اُنہوں نے اخبار تہہ کر کے رکھا اور اُسکی جانب متوجہ ہوئے۔

''ابّا! میں۔۔۔ میں آرٹس پڑھنا چاہتا ہوں۔ ملٹی میڈیا آرٹس۔۔۔''اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

''کیوں ؟''اُنہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیوں کے میری دلچسپی ہے اس فیلڈ میں''اُسے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا۔

''کیا اسکوپ ہے اِسکا؟'' دونوں ہاتھ باہم ملائے، وہ سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

''کافی زیادہ سکوپ ہے۔ الیکٹرونک میڈیا میں سٹوڈیو ڈیزائننگ کی ضرورت پڑتی ہے، اُسکے علاوہ فرنیچر ڈیزائننگ۔۔۔ انٹیریئر آرٹ ۔۔۔کافی سکوپ ہے اِسکا''وہ پرجوش سا بتانے لگا۔

''تو؟ تمہارے کہنے کا مطلب تم فرنیچر رنگو گے ؟لوگوں کے گھروں کو سجاؤ گے ؟''انہوں نے طنزیہ پوچھا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ کم از کم اپنے پڑھے لکھے باپ سے تو وہ اِس قسم کی سوچ کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

''نہیں ابّا! یہ مطلب نہیں ہے اِسکا، یہ تو۔۔۔''

''کیا مطلب پھر ؟''اُنہوں نے اُسکی بات کاٹی۔

''سفیر لودھی کا بیٹا یہ لڑکیوں والی پڑھائی پڑھے گا؟ کیا بتاؤں گا میں لوگوں کو؟ مذاق اڑائیں گے ملنے والے۔ باپ بزنس مین، ماں سرکاری افسر اور بیٹا یہ خواہشات رکھتا ہے دل میں۔افسوس ہے مجھے تمہاری سوچ پر''وہ بولنے پر آئے تو بولتے ہی چلے گئے۔ علی سر جھکائے سنتا رہا۔

''تم وہ ہی کرو گے جو میں چاہوں گا۔ تم میرے اکلوتے بچے ہو۔ مجھے بہت امیدیں ہیں تم سے، اور تم اُن پر اپنی بے جا دلچسپیوں کی وجہ سے پانی نہیں پھیر سکتے۔ تم بزنس ہی پڑھو گے۔'' انہوں نے فیصلہ سنایا۔

''پر ابّا! میں نہیں کر پاؤنگا'' وہ بے بسی سے گویا ہوا۔

''میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے۔ جو کہا گیا ہے وہ کرو، یہ تمہارا گھر نہیں ہے، جہاں اپنی مرضی کرتے پھرو۔ جاؤ اور جا کر داخلہ ٹیسٹ کی تیاری کرو'' وہ حکم صادر کر کے چلے گئے اور علی جانے کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اُسے شروع سے ہی آرٹس سے لگاؤ تھا۔ اسکول میں بھی وہ اکثر فن و فنون کے مقابلوں میں یا ورک شاپس میں حصہ لیتا رہتا تھا۔ اُسکی ڈرائنگ بہترین تھی، وہ اکثر پینٹنگ بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن نویں میں داخل ہوتے ہی اُسکے اِس شوق پر ابّا نے پابندی لگا دی تھی۔ انکا کہنا تھا کہ یہ پینٹنگ وغیرہ لڑکیوں کے کرنے کے کام ہیں۔ وہ خاموش ہو گیا، لیکن جب بھی وہ اپنے کسی کاروباری دورے پر ہوتے، وہ اُن سے نظریں بچا کر اپنا یہ شوق پورا کر لیتا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آگے چل کر انٹیریئر ڈیزائننگ کریگا اور اپنا انٹیریئر آرٹ کا بزنس کھولے گا۔ لیکن ابّا نے اس دن اُسکے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بی بی اے کے لیے انرولڈ ہو گیا تھا۔

---------+---------+---------

سولہ سال پہلے:

آج اُسکا جامعہ میں دوسرا ہفتہ تھا۔ وہ صبح جلدی جلدی اٹھا اور وقت سے کچھ قبل ہی سٹاپ پر جا پہنچا۔ اُسے کسی نے کہا تھا کہ یونیورسٹی کا پوائنٹ لینا ہو تو وقت سے پندرہ منٹ قبل ہی پہنچنا بہتر ہے، تاکہ پوائنٹ پر جگہ مل سکے۔ لیکن اُسکی توقع کے برخلاف، پوائنٹ پچھلے سٹاپ سے ہی نہ صرف کھچا کھچ بھرا ہوا آیا تھا، بلکہ اس میں تو کھڑے ہونا بھی جان جھوکوں کا کام تھا۔ بہت مشکل سے وہ جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ ابھی پوائنٹ کا انجن سٹارٹ ہی ہوا تھا کہ پیچھے سے کسی لڑکے کے چلانے کی آواز آئی۔

''رکو۔۔۔ رکو میں بھی ہوں۔۔۔'' ایک لڑکا پوائنٹ کے پیچھے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ پوائنٹ میں موجود دیگر لڑکوں نے جب اُسکی آواز سنی تو ڈرائیور کو رکنے کو کہا۔ مگر درمیان میں طلبہ کا جم غفیر ہونے کے باعث ڈرائیور تک آواز پہنچنا ناممکن تھا۔

''ارے رکو۔۔۔'' وہ لڑکا پیچھے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

’’بات سنو بھائی! دروازہ بجاؤ زور سے۔‘‘ وہ جو کہ دروازے کے پاس تقریباً لٹک ہی رہا تھا، سامنے کھڑے دو تین لڑکوں کی آواز پر چونکا۔

’’مطلب؟‘‘ وہ سمجھ نہیں پایا کہ اُسے ایسے کرنے کو کیوں کہا جا رہا ہے؟

’’ارے! مطلب کو چھوڑو، دروازہ بجاؤ جلدی۔‘‘ سب کے تقریباً ساتھ چیخنے پر اس نے گڑ بڑا کر دروازہ زور سے بجایا تو پلک جھپکتے میں پوائنٹ رک گیا۔

’’اوہ۔۔۔‘‘ تو اسی لیے دروازہ بجانے کہہ رہے تھے سب۔ پیچھے بھاگ کر آنے والا لڑکا تقریباً ہانپتے ہوئے دروازے پر لٹکا اور دروزہ دوبارہ بجادیا۔ دروازہ بجاتے ہی پوائنٹ پھر سے چل پڑا۔ یہ تکنیک دلچسپ تھی ویسے۔ لڑکا صرف لمبا ہی نہیں بلکہ ٹھیک ٹھاک لمبا تھا۔

’’تمہیں دیر ہو گئی آج، مجھے لگا آؤ گے نہیں شاید‘‘ طلبہ کے درمیان کچومر بنے ایک لڑکے نے آنے والے لڑکے سے پوچھا۔

’’سوا چھ فٹ کا تو ہے یہ‘‘ علی نے اُسکا معائنہ کرتے، اُسکے قد کا اندازہ لگانا چاہا۔

’’بس یار! آنکھ ذرا دیر سے کھلی آج‘‘ لڑکے نے کہا پھر علی کو دیکھا، جو اُن دونوں کی ہی گفتگو سن رہا تھا۔

’’شکریہ علی! تم نے پوائنٹ روک لیا ورنہ میں آج لیٹ ہو جاتا‘‘ اس نے خوش دلی سے کہا۔

’’مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ایسے کام کرتا ہے‘‘ علی نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔

’’میرا نام نوید عالم ہے۔ تمہاری کلاس میں ہی پڑھتا ہوں۔‘‘ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا جو کہ علی نے تھام لیا۔

’’ہاں! میں نے دیکھا ہے تمہیں، مگر نام نہیں معلوم تھا‘‘

’’ضرور دیکھا ہو گا، بھائی صاحب دور سے ہی نظر آ جاتے ہیں۔‘‘ پیچھے کھڑے لڑکے نے لقمہ دیا تو وہ ہنس دیا۔

’’لگتا ہے پہلی بار پوائنٹ کا سفر کر رہے ہو؟‘‘ نوید نے پوچھا تو اس نے کھسیاتے ہوئے سر ہلا دیا۔

’’کوئی بات نہیں! مجھے تو اب اس خواری کی عادت ہو گئی ہے‘‘ نوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس خواری کی عادت ڈالنے کا قطعاً شوق نہیں ہے، کیونکہ میری بائیک بننے گئی ہوئی ہے۔ ایک دو دن میں واپس آجائے گی، تو میں نے دوبارہ دیکھنا بھی نہیں ہے پوائنٹ کو۔۔۔" علی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہہ تو وہ ہنس پڑا۔

"پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کر لیتے یا کیب سے آجاتے"

"پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کی عادت نہیں ہے اور ٹیکسی اس لیے نہیں لے سکتا کیونکہ ابّا اجازت نہیں دینگے" جامعہ آگئی، تو وہ دونوں مرکزی دروازے پر ہی اتر گئے۔ ویسے تو پوائنٹ ڈیپارٹمنٹ تک جاتا تھا، لیکن بہت سے طلباء و طالبات مرکزی دروازے پر ہی اتر جاتے تھے کہ پوائنٹ میں بیٹھ کر اتنے اندر تک جانے کی ہمت باقی نہ بچتی تھی۔ اُن دونوں کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی لڑکے اور لڑکیاں وہیں اتر گئے۔

جامعہ کا یہ سب سے بڑا اور واحد آرک تھا، اسکے علاوہ بھی تین اور دروازے مختلف حصوں میں موجود ہیں، مگر اسکی خاص بات یہ ہے کہ یہ آرک جامعہ کی پچیسویں سالگرہ پر تحفتاً بنایا گیا تھا۔ اسی لیے اسے سلور جوبلی گیٹ کہتے ہیں۔ اس آرک کے دائیں جانب خوبصورت سا قد آدم سفید رنگ کا ستون ہے، جس پر سیاہ رنگ سے قائدِاعظم محمد علی جناح کا مقولہ درج ہے۔ آرک پر جلی حروف میں جامعہ کا نام لکھا ہوتا ہے، جو کہ بیس فٹ دُور سے بھی باآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس جامعہ نے کتنی ہی علم دوست شخصیت جیسے سید سجّاد علی شاہ، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، کتنی ہی اسلامی شخصیات جیسے ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا تقی عثمانی اور فن اور ادب کے ماہرین جیسے حسینہ معین اور وحید مراد جیسی نامور شخصیات کو بنایا تھا۔ وہ بھی انہیں سڑکوں پر چلتے تھے، انہیں ڈیپارٹمنٹ کی جماعتوں میں بیٹھ کر مستقبل کے خواب بنتے تھے۔ ان میں سے بہت سے اپنی زندگیاں اس ملک کی خدمت میں گزار کر جا چکے تھے۔ اور کتنے ہی اب بھی اس ملک کے لیے اپنی جانیں لگا رہے تھے۔

جامعہ کے آرک کے درمیان میں دو بڑے دروازے ہیں، جبکہ اِسی دروازے کی بائیں جانب ایک چھوٹا دروازہ بھی ہے۔ دایاں دروازہ بند تھا، اُسکے اندر کی جانب گارڈز بیٹھے رہتے تھے۔ جبکہ چھوٹا دروازہ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا، جو کہ اندر پیدل چلنے والے طویل ٹریک کی جانب کھلتا تھا۔ اس دروازے سے طلباء اور طالبات جوق در جوق اندر داخل ہو رہے تھے۔ بڑے دروازے سے گاڑیاں اندر جا رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی ٹریک پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بلاکس سے بنا یہ طویل ٹریک ہرے رنگ کے شیڈ سے ڈھکا ہوا تھا، جو پیدل چلنے والوں کو دھوپ سے محفوظ رکھتا تھا۔ ٹریک کے شروعات میں ایک آدھ بینک اور پبلک ڈیلنگ (عوامی لین دین) کے دفاتر نظر آرہے تھے۔ اُسکے بعد ٹریک

آگے کی طرف درختوں سے گھرا تھا۔ ٹریک کی دائیں طرف دو طرفہ سڑک تھی اور سڑک کی دوسری جانب بھی درختوں کی قطاریں تھیں۔ اتنے طویل ٹریک کے اختتام پر علم و ادب کا ایک جہاں شروع ہوتا ہے۔ یہ جامعہ اپنے آپ میں ایک پورا شہر لگتی ہے۔

''کیوں منع کرتے ہیں والد صاحب تمہارے؟'' اُسکے برابر چلتے نوید نے پوچھا۔

''انکو لگتا ہے میں اغوا ہو جاؤں گا اکیلے میں'' اُس نے کچھ جھنپتے ہوئے بتایا۔ شیڈ سے چھن کر آتی، صبح کی روشنی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

''ہیں؟ کیوں بھئی؟'' وہ حیران ہوا۔

''میں اکلوتا ہوں، اس لیے تھوڑے possessive ہیں میرے بارے میں۔ خیر چھوڑو، تم بائیک کیوں نہیں لے لیتے؟'' علی نے اُس سے پوچھا۔

''یار! میرا مسئلہ تھوڑا مختلف ہے۔ بائیک میرے بڑے بھائی کے پاس ہے۔ جب وہ نئی لے لیں گے، تو تب مجھے اُنکی استعمال کرنے کی اجازت ہو گی''

''کیوں؟ تم نئی بائیک کیوں نہیں لے سکتے؟'' علی نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ حالانکہ علی کا قد بھی اچھا تھا، لیکن وہ بھی نوید کے کندھوں تک پہنچ رہا تھا۔

''میرے ابّا کو لگتا ہے کہ میں نئی بائیک کہیں لے جا کر مار دونگا، حالانکہ میں نے چھپ کر اپنے دوستوں کے ساتھ چلانی سیکھ لی ہے، مگر ابّا کو کون سمجھائے'' نوید نے کندھے اُچکائے ہوئے کہا تو علی بس مسکرا دیا۔ سب کے اپنے اپنے مسئلے تھے۔

ٹریک ختم ہونے کے بعد جامعہ شروع ہو گئی تھی۔ بائیں طرح مختلف بینکوں کی شاخیں قطار میں نظر آرہی تھیں، اور ساتھ ہی کرکٹ کا بڑا سا گراؤنڈ بھی تھا، جہاں صبح صبح طلبہ و طالبات چہل قدمی کر رہے تھے، تو کچھ صبح ہی صبح کلاس نہ ہونے کے باعث ریکٹ کا میدان سجائے بیٹھے تھے، کچھ بستے اور کتابیں وہیں گھاس پر رکھے بیٹھے میچ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جبکہ دائیں طرف قطار در قطار، فن و ادب کے مختلف ڈیپارٹمنٹ تھے، فن و ادب (آرٹس) کے تمام ڈیپارٹمنٹس کی عمارتیں ترچھی (diagonal) کھڑی تھیں۔

کرکٹ گراؤنڈ اور ڈیپارٹمنٹ جہاں ختم ہو رہے تھے، وہاں درمیان میں چار جانب سے سڑکیں آکر ملتی ہیں، جیسے کوئی چورنگی ہو۔ اس جگہ کو کے یو سرکیولر روڈ کہتے ہیں۔ سامنے والی دو طرفہ سڑک پر کچھ نئے ڈیپارٹمنٹ تھے، جو سیدھا جا کر جامعہ کے دوسرے دروازے پر

ختم ہوتے تھے۔اس دروازے کا نام کنیز فاطمہ گیٹ ہے، جو کہ غالباً وہاں کی سوسائٹی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سرکیولر روڈ کی دائیں جانب والی دو طرفہ سڑک کافی طویل تھی۔ یہاں تمام سائنسی ڈیپارٹمنٹ موجود ہیں، جو کہ بہت اندر تک جاکر مختلف بین الاقوامی ریسرچ سینٹرز پر ختم ہوتے ہیں۔ طلبہ کا ایک جم غفیر ہمہ وقت یہاں نظر آتا ہے، وہ دونوں ہی سڑکیں اُنکی منزل نہ تھیں۔ بلکہ اُنہیں بائیں جانب مڑنا تھا۔ بائیں طرف والی سڑک پر مینجمنٹ سائنسز کے ڈیپارٹمنٹ ہیں، اُسکے علاوہ ایک چھوٹی سی مشہور نجی جامعہ آئی بی آئے بھی اسی سڑک پر واقع ہے۔ وہ دونوں بائیں طرف والی سڑک پر مڑ گئے۔ سائنس ڈیپارٹمنٹ کی سڑک کی طرح اس سڑک پر بھی کافی رش تھا۔ اس سڑک کے اختتام پر جامعہ کا تیسرا دروازہ تھا، جسے مسکن گیٹ کہتے ہیں۔ مینجمنٹ سائنسز کی یہ سڑک بھی مسکن کے نام سے مشہور تھی۔ سڑکوں پر بائیک اور گاڑیوں کے علاوہ قابل ذکر چیز رنگ برنگی شٹل سروس تھی۔ جو کہ ویسے تو بلا تفریق جنس سب کے لیے تھیں لیکن اُس پر ہمہ وقت طالبات کا قبضہ نظر آتا تھا۔ لڑکے شاذو ناظر ہی کبھی نظر آتے، وہ بھی ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر، پیچھے کے سیٹوں پر بیچارے خود نہ بیٹھتے کہ لڑکیوں کو جگہ مل جائے۔ علاوہ ازیں لڑکے کسی نہ کسی بائیک والے سے لفٹ لیکر بھی آتے جاتے نظر آرہے تھے۔

''تمہاری ہائٹ (قد) کتنی ہے؟'' بلآخر اُس نے پوچھ ہی لیا۔ نوید ہنس دیا۔

''چھ فٹ چار انچ'' اُس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''ماشاءاللہ! خاندانی قد ہے یا تم ہی لمبے نکلے ہو؟''

''قد تو سب ہی کا زیادہ ہے گھر میں ان میں کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہوں'' وہ بڑا ہنس مکھ تھا، بات بات پر ہنستا تھا۔ علی کو وہ پسند آیا۔

بائیں طرف کی سڑک پر مڑنے کے بعد کچھ دیر میں وہ لوگ ڈیپارٹمنٹ پہنچ گئے۔ کلاس میں آنے کے بعد دونوں ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ اس دن علی نے یونیورسٹی میں اپنا پہلا دوست بنایا تھا۔

---------+---------+---------

دو روز مزید گزر گئے اور اب تک اُسکی بائیک ٹھیک نہ ہو سکی تھی، اور آج اُسکا پوائنٹ بھی نکل گیا تھا۔ جسکے باعث اُسے سفیر صاحب نے ہی آج یونیورسٹی چھوڑا تھا۔ واپسی پر اُسے لینے کے لیے انہوں نے گاڑی بھیجی تھی، جسکے ڈرائیور کے پاس شناختی کارڈ نہ ہونے باعث گاڑی

سلور جوبلی پر ہی روک دی گئی تھی۔ اُسے ابّا نے فون کر کے اطلاع دے دی۔ اب اُسے ڈیپارٹمنٹ سے سلور جوبلی تک پیدل جانا تھا جو کہ کم از کم بھی پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ جی کڑا کر کے وہ پیدل ہی چل پڑا۔ چلتے چلتے اُسکی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ایک تو کوئی شٹل بھی اسے نہیں مل رہیں تھی اور جو شٹل آتی اس میں پہلے سے ہی لڑکیاں قبضہ کر چکی ہوتی۔ ناچار اُسے پیدل ہی چلنا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ جنوری کے آخری دن تھے، لیکن پھر بھی کافی تیز دھوپ تھی۔ کراچی میں سردی بھی بس برائے نام ہی آتی تھی۔

''یہاں آجاؤ'' کسی نے اُسے پیچھے سے آواز دی تھی، اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ہاتھوں میں چھتری پکڑے ایک لڑکا چلا آرہا تھا۔ علی نے اُسے دیکھ رکھا تھا۔ وہ اُسکی کلاس میں ہی پڑھتا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے مروتاً کہا، حالانکہ اس وقت اُسے چھاتے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس لڑکے نے اُسکی بات نہیں سنی اور خود ہی اُسکے قریب آگیا۔ علی کے قریب پہنچ کر لڑکے نے آدھی چھتری اُسکے اوپر کر دی، اس طرح کہ اب وہ دونوں ہی چھتری تلے تھے۔

''بہت شکریہ دوست!'' علی نے خوشدلی سے کہا تھا۔ اُسے واقعی اس وقت کسی سائے کی شدید ضرورت تھی۔

''کوئی بات نہیں، میں دھوپ کے پیش نظر یہ ساتھ ہی رکھ کر نکلا تھا۔''

''تم سلور جوبلی تک جا رہے ہو؟'' علی نے پوچھا۔

''ہاں!''

''تو پھر وہاں سے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ لو گے؟''

''نہیں! میرا بھائی آئے گا مجھے لینے، دراصل میں نے کل ہی اپنی پرانی گاڑی بیچی ہے، آج رات کو ہی نئی لینی ہے۔ تو بس آج کا دن یہ خواری کرنی ہی تھی اور تم؟'' اس لڑکے نے تفصیل سے بتایا۔

''میرے ابو کا ڈرائیور آیا ہے مجھے لینے، میری بائیک خراب ہے ذرا، بننے گئی ہوئی ہے۔ کل تک آجائے گی ان شاءاللہ۔۔۔''

''چلو! یہ تو اچھا ہے۔'' باتیں کرتے کرتے وہ دونوں سلور جوبلی تک آگئے تھے۔

''بہت شکریہ تمہارا''، علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''شکریہ کی کیا ضرورت ہے؟ تم میرے کلاس میٹ ہو'' لڑکے نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''میں معافی چاہتا ہوں، مجھے تمہارا نام نہیں معلوم'' علی نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''عمر۔۔۔ عمر حفیظ'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور میں علی'' اُس نے اپنا نام بتایا، اور پھر دونوں اپنے اپنے راستوں کی جانب بڑھ گئے۔

''اچھا لڑکا تھا ویسے'' اِن دو دنوں، میں اُسکا دو لوگوں سے تعارف ہوا تھا۔ ایک نوید اور دوسرا عمر، دونوں کے بارے میں ہی اُسکی اچھی رائے قائم ہوئی تھی۔ آگے جا کر وہ دونوں ہی اُسکے بہترین دوست بننے والے تھے۔۔۔

لیکن اُسکے بعد؟

کسے پتہ؟

---------+---------+---------

تیرہ سال پہلے:

''یہ سمجھاؤ ذرا مجھے'' مقدم نے ڈھیر ڈھیر کتابیں اُسکے سامنے رکھی۔

''یار رکو ذرا! میں پہلے یہ سوال سمجھ لوں رضا سے'' وہ خود رضا سے کوئی سوال سمجھ رہا تھا۔

''جلدی کرو، مجھے یہ فائنانس کا اسائنمنٹ سمجھ نہیں آرہا'' مقدم کرسی گھسیٹتے ہوئے بیٹھا۔ رضا نے سر اٹھا کر دیکھا، نوید اور عمر آپس میں کوئی آئیڈیا ڈسکس کر رہے تھے۔ خود وہ علی کو سوال سمجھنے میں مدد کر رہا تھا۔ مقدم کتابوں کے ڈھیر میں سر کھپا رہا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی انسان فارغ تھا تو وہ حسین تھا۔ وہ مسکرا دیا

''تم حسین سے پوچھ لو'' اُس نے مقدم کو پریشان دیکھا کر کہا۔

''چلو حسین! کل کا لیکچر سمجھا دو اسے''اس نے حسین کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

''خبر دار، یہ پڑھنے لکھنے کی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو'' وہ کرنٹ کھاتا ہوا پیچھے ہٹا، جس پر سب نے ہی اُسے سر اٹھا کے دیکھا۔

''تو تم لائبریری میں کرنے کیا آئے ہو؟''نوید نے چڑ کر پوچھا۔

''تم لوگوں کو کمپنی دینے''

''حسین! چند ہفتے رہ گئے ہیں امتحان میں، کچھ پڑھنا شروع کر دو اب'' عمر نے اُسے سنجیدگی سے سمجھایا تھا۔

''نہ۔۔۔۔''اس نے نفی میں سے ہلایا۔

''فیل ہونا ہے تم نے؟'' علی نے پوچھا۔

''پچھلے تین سالوں میں ہوا؟''اس نے الٹا سوال کیا۔

''پچھلے تین سال آسان تھے، ابھی پڑھائی زیادہ مشکل ہو گئی ہے اور آگے اس سے بھی زیادہ مشکل ہو گی''

''تم نے پچھلے سیمسٹر میں بھی یہی کہا تھا''اس نے ہوا میں اُڑایا۔

''کیا ہو گیا ہے؟ کیوں آوازیں آرہی ہیں آپ لوگوں کی؟'' لائبریرین کی زوردار آواز پر وہ لوگ واپس اپنے اپنے کاموں کی جانب متوجہ ہوئے کہ حسین کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس نے امتحانات کے دوران ملنے والے وقفے میں ہی پڑھنا ہوتا تھا۔ اس سے قبل کتابوں کو ہاتھ لگانا وہ اپنی توہین سمجھتا تھا۔

---------+---------+---------

''کہاں جا رہے ہو؟'' علی گھر سے نکلنے کے تیاری کر رہا تھا، جب سفیر صاحب نے اُسے آواز دی۔

''دوستوں کی طرف باربی کیو پارٹی ہے آج، وہیں جا رہا ہوں''

''مجھ سے اجازت لی تھی؟''اُنہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''میں نے امی کو بتادیا تھا''اس نے وضاحت پیش کی۔

''بتادیا تھا؟ واہ! شہزادے صاحب اب پوچھنا گوارا نہیں کرینگے بلکہ اطلاع دینگے'' وہ اپنے ازلی انداز میں شروع ہو چکے تھے، جس سے علی ہمیشہ خائف رہتا تھا۔

''ابّا! میرا وہ مطلب۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ اُسکی سنتے ہی کہاں تھے؟

''میں نے تمہارا داخلہ پڑھنے کے لیے کروایا تھا یا دوستیاں نبھانے کے لیے؟''

''جانے دیں ناں! وہ کب اپنے دوستوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے؟ میں نے ہی آج اجازت دی ہے اسے'' علی کی امی درمیان میں بولی تھیں۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی، کل صبح میرے دوستوں کی طرف دعوت ہے۔ وہ تمام لوگ بزنس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ تم ان سے ملو گے۔تاکہ تمہاری پی آر ابھی سے مضبوط ہو''

''لیکن ابّا وہاں تو صبح جانا ہے نا'' علی نے کمزور سے لہجے میں کہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں یاروں کے ساتھ بھی گھومنا پھرنا چاہتا تھا، لیکن اُسکے والد نے ابھی سے اُسکے سر پر کاروبار کا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

''تو؟ رات بھر گھر سے باہر رہو گے، تو صبح جلدی کیسے اٹھو گے؟ کوئی ضرورت نہیں باہر جانے کی'' وہ اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔

''ابّا! میں تین بجے سے پہلے پہلے واپس آجاؤں گا۔ صبح بھی چلونگا آپکے ساتھ، ابھی جانے دیں پلیز۔ نوید باہر ہی کھڑا ہے''اس نے منت کی، جو کہ وہ بچپن سے کرتا آرہا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ علی''اُنکے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُسکی امی بول پڑیں۔

''لیکن۔۔۔''اُنہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

''اسکا دوست باہر کھڑا ہے، منع کرنا اچھا لگے گا کیا؟''اُسکی والدہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تو بلانے کو کس نے کہا تھا؟'' وہ سخت برہم ہوئے۔

''بتا تو رہی ہوں آپکو، میں نے ہی کہا تھا، اسی لیے بلایا ہے اس نے۔ اب جانے دیں، صبح میں بھیج دونگی اسے آپکے ساتھ''اُنہوں نے تسلی دی تو اب کے سفیر صاحب نے کچھ نہ کہا، پر وہ تپے ہوئے لگ رہے تھے۔

''جاؤ بیٹا تم! نوید انتظار کر رہا ہوگا''اُنکے اشارہ کرنے پر علی نے ڈرتے ڈرتے اپنے والد کو دیکھا، جو سخت ناراض نظر آرہے تھے، وہ تھک کر باہر نکل آیا۔

''وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، مجھے بہت امیدیں ہیں اُس سے، اور وہ میری اُمیدوں کو برباد کرتا پھر رہا ہے''اُسکے جاتے ہی وہ خفگی سے بولے تھے۔

''کہاں رہ گئے تھے تم؟''اُسکے انتظار میں پچھلے پندرہ منٹ سے باہر کھڑے نوید نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''سوری یار! بس ابّا نے روک لیا تھا''وہ آہستہ سے کہتا ہوا اُسکی بائیک پر پیچھے بیٹھا۔

''اتنی مشکلوں سے بھائی سے بائیک مانگ کر لایا ہوں۔ صبح سے پہلے پہلے واپس کرنی ہے۔ اب بھائی نئی بائیک خریدے تو یہ کھٹارا میرے حصے میں آئے۔ کہا بھی ہوا ہے کہ مجھے ایک بائیک خرید دیں، اتنی رات گئے بسوں کا سفر۔۔۔''وہ بائیک چلاتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔ اُسکے اپنے ہی مسئلے تھے۔ جبکہ علی خاموش تھا۔

پارٹی میں بھی وہ سارا وقت گم سم سا ہی رہا تھا۔ سب اُس سے پوچھتے رہے اور وہ سر درد کا بہانہ بناتا رہا۔ اُسے صبح کے بارے میں سوچ سوچ کر ہی کوفت ہو رہی تھی۔ بچپن سے ہی وہ اکلوتے ہونے کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ اُسکے ابّا اُسے ایک کامیاب کاروباری شخصیت بنانا چاہتے تھے۔ یہ کوئی ایسی بری بات نہ تھی، لیکن اس خواہش کے پیچھے وہ اُسکے ساری زندگی اذیت ناک بناتے جا رہے تھے۔ وہ اُسے ہر وقت پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے، ہمیشہ اُسے اپنی عمر کے لوگوں کی محفلوں میں لے جاتے۔ حتیٰ کہ عید و شادی بیاہ کی دعوتوں میں بھی اُسکے کزنز وغیرہ مل کر ہلا گلّہ کر رہے ہوتے اور اُسکے ابّا اُسے اپنے دوستوں اور جاننے والے کاروباری شخصیات کی جھرمٹ میں بٹھا دیتے۔ وہ صرف اُنکی خواہش پر بزنس پڑھ رہا تھا اور کیسے پڑھ رہا تھا؟ اور کتنی ہی مشکل سے وہ ایک ناپسندیدہ پڑھائی میں اچھی جی پی اے بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا؟ یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اُسکے ابّا کو تو اندازہ بھی نہ تھا کہ وہ نہ صرف علی کی زندگی میں بلکہ اُسکی شخصیت میں بھی کس قدر کڑواہٹ گھول چکے ہیں۔ لیکن آج کے دن اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اُسکے ابّا تو ویسے ہی اُسکے لیے کیریئر کا چناؤ کر ہی چکے ہیں، لیکن وہ اپنی تعلیم تو کم از کم اپنی مرضی کی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر کاروبار ہی کرنا ہے تو پھر انٹیریئر ڈیزائننگ کا کاروبار کیوں نہیں؟

---------+---------+---------

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اس لائق تھے کہ کوئی بھی لڑکی خوشی خوشی تم سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے؟''

''میں لائق ہوں یا نہ ہوں، لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے شادی کرنے لیے دل سے راضی ہے۔اُسے مجھ سے بہتر انسان اور کوئی نہیں مل سکتا''

''خوش فہمی ہے جناب کی''

''کیا تم نے اُسکے چہرے پے چھائی رونق نہیں دیکھی؟''

''بیٹیوں کو ماں باپ کو دکھانے کے لیے خوش رہنا پڑتا ہے۔ تمہارے جیسے انسان کے ساتھ کبھی کوئی خوش نہیں رہ سکتا، وہ تو پھر بھی ایک نرم دل کی لڑکی ہے''

''یہ تم نہیں، تمہارے اندر کا حسد بول رہا ہے''

''یہ حسد نہیں حقیقت پسندی ہے۔اور تمہاری خوش فہمی تمہیں یہ تسلیم کرنے سے روک رہی ہے۔''

''نہیں! حقیقت یہ ہے کہ تمہارے اندر کا حاسد اُسکی خوش قسمتی سے جل رہا ہے''

''تم دونوں کی اوور ایکٹنگ ختم ہو گئی ہے تو کھانا آرڈر کر دیں؟'' رضا نے بیزاریت سے اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب تم نے اب تک کھانا آرڈر نہیں کیا تھا؟'' حسین نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔'' اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ حور! جا کے کھانا آرڈر کر آؤ'' اس نے اپنے سامنے بیٹھی حور عین سے کہا۔

''نہیں نہیں! میں تو حاسد ہوں کیا پتہ تمہارے کھانے میں زہر ملانے کا آرڈر دے آؤں'' اس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں حور عین! میں جانتا ہوں کہ تم ابھی اتنی بہادر نہیں ہوئی ہو''

''میں نہیں جا رہی، تم مرد ہو، تم جاؤ''

''نہ نہ۔۔۔لیڈیز فرسٹ۔۔۔۔''

''اب اگر تم دونوں میں سے کوئی آرڈر دینے نہیں گیا نہ تو میں اپنا کھانا پارسل کروا کے لے جاؤنگا'' رضا نے چڑ کے کہا۔

''اچھا آئیڈیا ہے، میں بھی یہی کرونگا'' وہ بھی آرام سے کرسی سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا، تو حور منہ بناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت وہ تینوں ایک ریسٹورونٹ میں بیٹھے تھے۔ حسین، رضا کو اپنی منگنی کی خوشی میں لنچ پر لایا تھا لیکن ساتھ میں حور عین بھی زبردستی چلی آئی تھے اور پچھلے آدھے گھنٹے سے اُسے یہ یقین دلانے کے کوشش کر رہی تھی کہ ایمان سے منگنی ہونا اُسکے لیے خوشی کا باعث نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ اُسکے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ حسین جیسے نفسیاتی مریض سے کوئی صحیح الدماغ لڑکی شادی کرنے پر راضی کیسے ہو گئی؟ یقیناً ایمان کو مجبور کیا گیا ہے۔ اور رضا پچھلے آدھے گھنٹے سے بھوکے پیٹ اُنکی بکواسیات سننے پر مجبور تھا۔

''ایک بات پوچھوں حسین؟'' حور کے جانے کی بعد رضا نے حسین کو مخاطب کیا۔

''دس پوچھو'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پچھلے کچھ سالوں میں حسین کی رضا سے بہت گہری دوستی ہو چکی تھی۔

''ایمان سے منگنی میں تمہاری مرضی شامل ہے؟''

''کیا مطلب؟ تم بھی حور والی فضولیات پر۔۔۔''

''فنکاریاں بند کرو، میں نے تمہاری بات پوچھی ہے'' رضا نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا ورنہ وہ تو سنجیدہ نہیں ہونے والا تھا۔

''ظاہر ہے میری مرضی سے ہی ہوا ہے''

''تمہیں وہ پسند ہے؟''

''کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟''

''تم کبھی اپنی کوئی بات نہیں بتاتے، ایمان سے تم نے منگنی کر لی لیکن پہلے سے اُسے پسند کرتے تھے یا نہیں، کچھ بھی تو نہیں بتایا تم نے''
حسین مسکرا دیا۔

''جب کچھ تھا ہی نہیں تو بتاتا کیا؟ وہ اچھی لڑکی ہے، بابا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے رضامندی دے دی'' وہ بتا رہا تھا جبکہ رضا کی نظریں دور کاؤنٹر پر کھڑی حور عین پے ٹکی تھیں۔ وہ کیا سوچ رہا تھا بس وہی جانتا تھا۔۔۔۔

---------+---------+---------

اور اپنے فیصلے کی اسے کافی بھاری قیمت چکانا تھی، ماں باپ کی محبت تو بے لوث ہوتی ہے پھر اولاد کے خود کی خاطر لیے گئے فیصلے کے بیچ میں یہ محبت اپنا خراج کیوں مانگنے لگتی ہے؟

وہ اُسکا بھلا چاہتے تھے، لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتے تھے کے انکا بیٹا ایک جیتا جاگتا انسان ہیں۔ اُسکی بھی تو خواہشات ہیں۔ اور دیکھا جائے تو وہ اب بھی اپنے باپ کی خواہش کا احترام ہی کر رہا تھا۔ وہ اُسے بزنس مین بنانا چاہتے تھے، تو وہ بھی مستقبل میں کاروبار کرنے کا ہی ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن کاروبار وہ جو اُسکی پسند کا ہو۔ اِسی لیے گریجویشن کے بعد اس نے ملٹی میڈیا آرٹس میں ماسٹرز کرنے کے لئے باقاعدہ داخلہ لے لیا۔ اس نے جھوٹ بولنے سے بہتر جانا کہ وہ سچ سچ اپنے اقدام کے متعلق انہیں آگاہ کر دیا۔

''تم۔۔۔ تم۔۔۔'' حیرت کی زیادتی سے وہ گنگ تھے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ علی انکے خلاف جا سکتا ہے۔

''تم کر کیسے سکتے ہو ایسا؟'' وہ جیسے بے یقینی کی کیفیت میں تھے۔

''ابّا! میری بات سنیں۔ میں آگے جا کر۔۔۔۔''

''میرا تمہارے مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارا جو دل چاہے کرو کیونکہ اب تم اپنے فیصلے خود لے سکتے ہو۔'' انہوں نے اُسکی بات پوری ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ علی نے انہیں ایسے سرد لہجے میں بات کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔

''تم نے مجھے بہت مایوس کیا، میں تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کر رہا تھا، لیکن تم نے اپنی اِن زنانہ خواہشات کی خاطر میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ مجھے اب نہ تمہارے کیریئر سے مطلب ہے نہ ہی تمہاری زندگی سے، تم گر بھی رہے ہوگے، تو تمہارا باپ اب تمہیں تھامنے کبھی نہیں آئیگا۔ پتہ تو چلے باپ کے بنا دنیا کیسی ہے؟'' وہ کہہ کر اُسکا جواب سننے کے لیے رکے نہیں تھے۔ علی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''امّاں!''اس نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا۔

''تم پریشان نہ ہو، میں سمجھاؤں گی انہیں''انہوں نے اُسکے بال سہلاتے ہوئے تسلی دی۔اور اس دن کے بعد سب کچھ بدل گیا۔وہ چاہے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے، یا کزنز کے ساتھ، چاہے تو جلدی گھر آئے یا دیر رات سے، پاس ہو یا فیل۔۔۔سفیر صاحب کو اُس سے کوئی مطلب نہ تھا۔دیکھا جائے تو علی اب اپنے ہر فیصلے میں آزاد تھا لیکن یہ کیسی آزادی تھی؟اس آزادی کی قیمت اُسے اپنی باپ کی ناراضگی کی صورت میں ادا کرنے پڑ رہی تھی۔انہوں نے اس سے بلکل قطع کلامی کر لی تھی۔اور اُسکی زندگی میں کوئی ایسا دن نہ آیا تھا، جب اُسکے باپ نے اس سے بات نہ کی ہو یا اُسکے سلام کا جواب نہیں دیا ہو۔

اور اب انکا علی کو ایسا نظر انداز کرنا، جیسے اُسکا وجود ہی اس دنیا میں موجود نہ ہو، اُسے پاگل کر رہا تھا۔اپنی مرضی کی پڑھائی پڑھنے کے باوجود بھی وہ اندر سے بہت خالی ہو گیا تھا۔ماں باپ بچوں کی ہر خواہش پوری کر کے اُنکی زندگی کی سب سے بڑی خواہشات میں انہیں اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ہمیشہ جلنے اور کڑھنے کیلئے۔۔۔وہ خوشی پھر انکے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔

زندگی ایسے ہی ڈگر پر چل رہی تھی، وہ بے انتہا اُداس اور کچھ کچھ چڑچڑا رہنے لگا تھا۔

''وہ تمہارے ہی باپ ہیں، فکر نہ کرو زیادہ عرصے ناراض نہیں رہیں گے تم سے۔''ایسے ہی ایک دن وہ سب ساتھ بیٹھے تھے۔جب مقدم نے اسکو اُداس دیکھ کر تسلی دی تھی۔

''زیادہ عرصہ؟آخری بار انہوں میں مجھ سے ڈیڑھ سال پہلے بات کی تھی۔''اس نے دکھ سے کہا۔وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اُسکے باپ کیلئے وہ گھر میں رکھے سامان جتنی اہمیت کا حامل ہو گا۔اس بات پر کچھ دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔

''انہوں نے نہیں کی، تو تم کوشش کر لو''نوید نے کہا۔

''میں نے بہت کوشش کی ہے، انکے پاس بیٹھ کر بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو پہلے تو وہ اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے، لیکن اب تو وہ اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے میں وہاں ہوں ہی نہیں یا ہوں بھی تو اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں، ایک نظر دیکھتے بھی نہیں ہیں مجھے۔''وہ بے حد مایوس تھا۔

''تم اپنی پڑھائی پر فوکس کرو، اپنا کیریئر بناؤ۔ تم کامیاب ہو گئے تو دیکھنا اُنکے شکوے اپنے آپ ہی دم توڑ جائینگے۔'' وہ سب ہی کسی نہ کسی طرح اُسکا حوصلے بڑھاتے رہتے تھے، یہ انہی لوگوں کا ساتھ تھا ورنہ اس نے تو شروعات میں ہی سوچ لیا تھا کہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر ایم بی اے میں داخلہ لے لیگا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی بھی اس پڑھائی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا، وہ اپنے باپ کو کچھ بن کر دکھانا چاہتا تھا اور اُسکے لیے اچھے سے پڑھنا ضروری تھا اور پڑھائی جب من پسند ہو گی تبھی تو اچھے سے ہو سکے گی۔

''اگر تم لوگ کچھ دیر مزید یہی دکھی باتیں کرتے رہے، تو میں گھر چلا جاؤں گا'' حسین حقیقتاً بے زار ہو رہا تھا۔

''ارے! مجھے یاد آیا تمہاری منگیتر تمہیں ڈھونڈ رہی تھی کچھ دیر پہلے'' مقدّم کو ایکدم ہی یاد آیا۔

''مجھے؟ کیوں؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''کہہ رہی تھی کہ حسین یا حور عین میں سے کوئی ملے تو اُس سے کہنا کہ مجھے آج گھر چھوڑ دے۔'' اُس نے بتایا۔

''یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو؟'' اُس نے گھورنے پر اکتفا کیا۔

''ابھی آدھے گھنٹے پہلے ہی تو بتایا ہے، کہہ رہی تھی کہ تین بجے تک آف ہے اُسکا۔''

''مجھے ہی جانا پڑے گا، حور تو آئی نہیں آج'' وہ مزید بیزار ہوا، بہت عرصے بعد دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا، اتنے جلدی گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔

''کیوں؟''

''اُسکی بات پکی کی رسم ہے آج، چھوٹی موٹی سی گھریلو تقریب ہے۔ لیکن پھر بھی چھٹی کر کے گھر بیٹھ گئیں میڈم''

''واقعی؟ مبارک دینا میری جانب سے'' اتنے عرصے میں رضا پہلی بار بولا تھا۔

''کس سے ہو رہی ہے؟'' عمر نے پوچھا۔

''چاچو کے کسی دوست کا بیٹا ہے۔ اظہر الدین، بزنس مین ہے، ہے تو حور سے کوئی آٹھ نو سال بڑا لیکن سمجھدار انسان ہے'' وہ عام سے لہجے میں بتا رہا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے، پر تم کیوں اتنے چڑ چڑے ہو رہے ہوں؟'' علی کو ایکدم ہی احساس ہوا کہ حسین آج تھوڑا اُلجھا اُلجھا سا تھا۔

''ارے! کام ہی اتنے ہیں یار! خیر چھوڑو، مجھے اب جانا پڑیگا۔ آخر پک اینڈ ڈراپ سروس بھی تو مجھے ہی دینی ہے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا، پھر ایک نظر خاموش سے علی پر ڈالی۔ ''بات سنو تم ملکہ جذبات! اگلی بار ملو تو شکل درست کر کے آنا'' آخر میں اُسے چھیڑتا ہوا سب کو خدا حافظ کہتا چلا گیا۔ علی نے بس گھورنے پر اکتفا کیا۔

''تم پریشان نہ ہو، وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائیگا سب'' عمر نے اُسے ایک بار پھر تسلی دی تھی۔ جبکہ خاموش بیٹھے رضا کی نظریں دور تلک جاتے حسین پر تھیں۔ دماغ میں اُسی کے الفاظ گونج رہی تھے۔

''حور عین کی بات پکی۔۔۔ آٹھ نو سال بڑا۔۔۔'' الفاظ ذہن میں گڈ مڈ ہونے لگے۔

---------+---------+---------

لیکن اسکی نوبت نہ آسکی۔ اُسکے باپ نے ایک دن خود ہی اُسے اپنے پاس بلایا۔

''جی ابّا!؟''

''بیٹھو علی'' انہوں نے کتنے عرصے بعد اُسے مخاطب کیا تھا؟ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ ہے تو تمہاری زندگی کے حوالے سے لیکن اب چونکہ تم خود مختار ہو گئے ہو تو میں نے سوچا کہ پہلے تم سے اجازت لے لوں، کہیں بعد میں مجھے ہی شرمندہ نہ ہونا پڑے'' اُنہوں نے بہت سادے سے انداز میں بات شروع کی تھی۔ لیکن وہ چند جملے ہی علی کو زمین میں گاڑنے کے لیے کافی تھے۔

''نہیں ابّا! آپ میرے بارے میں فیصلہ لے سکتے ہیں'' اُس نے خود کو کہتے سنا۔ حالانکہ ایسا بھی کوئی جرم نہیں کیا تھا اُس نے، لیکن پھر بھی وہ سر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔

''ہونہہ۔۔۔ فیصلہ لے لوں اور بعد میں تم اُسے اپنی خواہشات کے بھینٹ چڑھا دو اور مجھے کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑو؟'' علی نے تڑپ کر اُنہیں دیکھا تھا۔

"ابّا! آپ مجھے ایک کاروباری انسان کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں ناں؟ آپ ایک بار میرا بزنس پلان تو سن لیں۔ میرے آئیڈیاز آپکو ہرگز مایوس نہیں کرینگے" اُس نے بے حد دکھ کے ساتھ اپنے باپ سے کہا تھا۔

"میں اپنی بات پر قائم رہتا ہوں علی! جب کہہ دیا کہ تمہارے کیریئر سے میرا کوئی واسطہ نہیں، تو مجھے اپنے آئیڈیاز دکھا کر اپنا اور میرا وقت برباد نہ کرو۔" سفیر صاحب کے لہجے کی کڑواہٹ علی کے اندر تک اتر گئی تھی۔

"آپ اس سے جو بات کرنے آئے تھے وہ کیجیے" پاس بیٹھیں علی کی والدہ نے گفتگو کا رخ کسی اور جانب مڑتے دیکھ کر اُنہیں ٹوکا۔

"بنا تمہید کے بات کرتا ہوں" وہ سر جھٹک کر دوبارہ گویا ہوئے۔ علی کا پورا وجود کان بن گیا۔ اُسکے کیریئر میں اُنہیں کوئی دلچسپی نہ تھی تو پھر وہ کیا بات کرنا چاہتے تھے؟

"میرے ایک دوست شہیر آفندی کی بیٹی ہے فاطمہ، میں چاہتا ہوں کہ تم اس ویک اینڈ اُس سے مل لو۔ شہیر تمہیں اور تم اُسکو تو بہت اچھے سے جانتے ہی ہو۔ اسی لیے بہتر ہے کہ تم اُسکی بیٹی سے بھی مل لو" وہ کہتے جا رہے تھے اور علی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"مجھے کس لیے ملنا ہے اُس سے؟" وہ حیران تھا۔

"میں نے اُسے تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے ایک بار مل لو، کہیں بعد میں یہ نہ کہو کہ میں نے اپنی پسند تمہارے اوپر تھوپ دی ہے" اُنہوں نے طنز کے بنا بات کرنا سیکھا ہی نہیں تھا جیسے۔ علی ساکت بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس حوالے سے تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا، ابھی تو وہ پڑھ رہا تھا۔ اُسے اپنے باپ کو کچھ بن کر دکھانا تھا اور وہ اس پر کونسی ذمے داری ڈال رہے تھے؟

"تم نے کچھ کہا نہیں بیٹا؟" اُسکی والدہ نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا تو اس نے نظر اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا، جو جانچتی نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"کہاں ملنا ہے اُس سے؟" علی نے آہستہ سے پوچھا۔

"وہ شہیر بتا دیگا، تم بس اپنے ویک اینڈ کے سارے پلان (منصوبے) کینسل (ختم) کرو۔ اور اُس سے ملنے کی تیاری کرو۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، جو کہ گفتگو برخاست ہونے کی نشانی تھی۔

"میں اور تمہارے ابّا مل آئے ہیں اُس سے، اچھی، پیاری لڑکی ہے۔" اُسکی ماں نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلیں گئی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سفیر صاحب کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک کے اور پلٹ کر اُسے دیکھا۔

"ایک بات یاد رکھنا علی!" علی نے سر اٹھا کر اُنہیں دیکھا۔ "تمہارے کسی بھی آئیڈیا یا بزنس پلان کو میں ہر گز انویسٹ (سرمایہ کاری) نہیں کروں گا۔ یہ کیریئر تمہاری منشا تھی، اسکے لیے سرمایہ بھی تم اکھٹا کروگے" علی کو لگا، کسی نے اُسے گہرے سمندر میں اٹھا کر پھینک دیا ہے۔ آج اُسے اپنا باپ خود سے بہت دور لگا تھا۔ وہ کہہ کر چلے گئے اور علی کتنی ہی دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ صرف ایک کیریئر پسند کرنے کی اتنی بڑی سزا دی تھی اُنہوں نے؟

"کوئی بات نہیں، میں بہت محنت کرونگا۔ اور اپنے پیسوں سے، اپنی کمائی سے انٹیریر آرٹ اور فرنیچر ڈیزائننگ کا بزنس شروع کرونگا۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔ میں بھی آپکا بیٹا ہوں ابّا! اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا" وہ دل ہی دل میں منصوبے بنا رہا تھا۔ لیکن وہ بھول گیا تھا کہ مقابل اُسکا باپ ہے۔ اُنکی منصوبہ بندی کو علی ابھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

---------+---------+---------

پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ شہیر صاحب کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا، اُنکی بیگم کے جوڑوں کے درد اور بجلی کے بل کے رونے سن رہا تھا۔ شہیر صاحب نے اُسے ہفتے کے دن کسی ریسٹورونٹ میں فاطمہ سے ملنے کو کہا تھا، جسے اس نے مناسب الفاظ میں منع کر دیا تھا۔ اُسکے نزدیک، کسی بھی انجان لڑکی سے اکیلے میں ملنا، وہ بھی گھر سے باہر بلکل نامناسب عمل تھا۔ مناسب یہی تھا کہ وہ اُسکے گھر والوں کی موجودگی میں ہی اس سے مل لے۔ البتہ وہ لوگ کافی آزاد خیال تھے۔

ملاقات کیا ہونی تھی، ایک تکلّف و رسم تھی جو پوری کرنی تھی۔ باقی جواب تو وہ پہلے سے ہی سوچ چکا تھا۔ شہیر صاحب کا گھر ویسا ہی تھا، جیسا کسی بھی اپر کلاس کا ہوتا ہے۔ وہ ایک ملازمت پیشہ انسان تھے، اور مشہور و معروف کمپنی میں جنرل مینیجر تھے، سہیل صاحب کے بچپن کے دوست ہونے کے ناطے آج تک اُن سے ملنا جلنا تھا۔ علی پہلے بھی اُنکے گھر آیا تھا لیکن کبھی اُنکی عورتوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح اُنکی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اُس نے کتنا کہا تھا امی کو کہ ساتھ چلے لیکن انکو ایک سیمینار میں جانا تھا۔ لہذا وہ ساتھ نہ آئیں۔

''بیٹا! شہیر ہوتے، تو وہ ہی تمہیں کمپنی دیتے لیکن وہ فلحال ایک ضروری کام سے گئے ہوئے ہیں۔ جاتے ہوئے تم سے بہت معذرت کرنے کو کہا تھا'' اُنھوں نے اُسے خاموش بیٹھے دیکھ کر سمجھا کہ شاید وہ بور ہو رہا ہے۔

''نہیں آنٹی! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اندر سے وہ شدید کوفت کا شکار تھا۔ دل کر رہا تھا کہ بس فاطمہ یہاں آئے اور وہ تکلفات پورے کر کے چلتا بنے۔

''بس بیٹا! فاطمہ آتی ہی ہو گی، اُس نے بینک سے ہاف ڈے (آدھی چھٹّی) لیا تھا تاکہ جلدی آجائے'' اُنھوں نے شرمندگی سے کہا۔

''وہ نوکری کرتی ہیں؟'' علی نے حیرت سے پوچھا۔ اُسے لگا تھا کہ شاید وہ پڑھ رہی ہو گی۔

''ہاں بیٹا! تمہیں تمہارے والد نے نہیں بتایا؟'' وہ حیران ہوئی تو علی گڑبڑا گیا۔ فاطمہ کے بارے میں تو اس نے کچھ جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

''نہیں نہیں۔۔ بتایا تھا، بس میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔'' اُس نے وضاحت دی۔

''روبی! یہ سامان پلیٹوں میں نکال دو'' ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر سے ایک نسوانی آواز آئی تھی۔

''اوہ۔۔ فاطمہ آگئی۔ میں اُسے یہاں بھیجتی ہوں۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑیگا'' وہ خوشی سے کہتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب علی کمرے میں اکیلا تھا۔ اسکو اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ اچھا بھلا پر اعتماد لڑکا تھا، اپنے باپ کے کاروباری حلقے میں کم عمری سے ہی اُسکا اٹھنا بیٹھنا تھا، لیکن کسی بھی لڑکی سے ملنے کا یہ اُسکا پہلا تجربہ تھا۔ شادی بیاہ، گھر بسانا یا لڑکی پسند کرنا، ان سب کے لیے اُسکے پاس نہ کبھی وقت تھا نہ اُس نے ایسے کسی کام میں دلچسپی لی تھی۔ ایسی صورتحال میں کیسے پیش آنا ہوتا ہے، اُسے نہیں معلوم تھا۔

''پتہ نہیں وہ کیسی ہو گی؟'' علی نے سوچا، اور شاید پہلی ہی بار اُس نے فاطمہ کے بارے میں سوچا تھا۔

''جیسی بھی ہو، مجھے تو ابّا کو ایک ہی جواب دینا ہے۔'' اُس نے دل میں کہا۔

''السلام علیکم! سوری مجھے دیر ہو گئی۔ میں نے بینک والوں سے دو دن پہلے سے ہی ہاف ڈے مانگا ہوا تھا۔ لیکن عین وقت پر انکو کوئی ضروری کام یاد آگیا اور میرے نہ نہ کرنے کے باوجود مینجر نے۔۔۔'' ایک خوبصورت سی نازک لڑکی بولتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں

داخل ہونے سے لیکر، صوفے پر بیٹھ کر کشن گود میں رکھنے تک اُسکی زبان فراٹے بھرتی رہی تھی۔ اور علی۔۔۔ وہ سن ہی کہاں رہا تھا؟ نِگاہیں اسکے چہرے پر جو پڑیں تو پلٹنا ہی بھول گئی۔ وہ ہرے رنگ کے سوٹ پر سلیقے سے دوپٹہ ڈالے، میک اپ سے عاری چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟'' اُس نے کیا کچھ کہا تھا یاد نہیں، بس یہ آخری جملہ ہی علی کے کانوں میں پڑا۔

''آں۔۔۔ نہیں تو، بلکل نہیں'' حالانکہ اُسے دیر سے آنے والے لوگ ہر گز پسند نہیں تھے اور وہ طے کیے بیٹھا تھا کہ فاطمہ آئیگی تو اُسے جتائے گا ضرور، کہ کب سے اُسکا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اپنے بنائے سارے منصوبے بھول گئے۔

''آپکو مجھ سے جو بھی پوچھنا ہے پوچھ سکتے ہیں۔ میں مزید آپکا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی'' اُس نے ایکدم ہی سنجیدگی سے کہا تو علی کو یاد آیا کہ وہ یہاں کرنے کیا آیا تھا۔

''ہاں! آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں یہاں کس سلسلے میں آیا ہوں۔'' اُس نے پر تکلف انداز میں بات شروع کی ''دیکھیں! میں جھوٹ نہیں کہوں گا آپ سے، شادی میری پلاننگ کا حصہ نہیں رہی کبھی بھی، اسی لیے میں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں لیکن اب چونکہ میرے ابّا کی خواہش ہے تو۔۔۔۔'' وہ کہہ کر رکا، چند منٹ پہلے ملی لڑکی کو اپنے اور اپنے باپ کے تعلقات بتانا کہیں کی عقلمندی نہ تھی۔ لیکن اُسے کسی دھوکے میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''میرے کچھ خواب ہے، ابھی میں اُنہیں پورا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے افسانوی باتیں نہیں ہوتی، میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں۔ چاند تارے توڑنا تو دور کی بات ہے، میں تمہیں وقت بھی شاید نہ دے سکوں۔ یہ سب چیزیں تمہیں اسی لیے بتا رہا ہوں کہ شادی کہ حوالے سے یقیناً تمہاری کچھ خواہشات ہونگی اور میں ہو سکتا ہے کہ وہ پوری نہ کر سکوں۔ اسی لیے تمہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔'' علی کب آپ سے تم پر اُتر آیا تھا اُسے خود اندازہ نہ ہوا تھا۔

''تو تم چاہتے ہو کہ میں انکار کر دوں؟'' فاطمہ نے پوچھا۔ لحاظ اور مروت اب اُسکی جانب سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اُسکے چہرے سے کسی بھی قسم کے تاثرات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

''ہر گز نہیں! میں عورت کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلانے والا آدمی نہیں ہوں۔ مجھے انکار نہیں کرنا اور نہ کروں گا۔ میں بس تمہیں۔۔۔ حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔یعنی ہو سکتا ہے کہ تم میرے جیسے خشک مزاج انسان کے ساتھ بیزار ہونے لگو۔ بعد میں مجھ سے شکایت کرو، اس سے بہتر ہے کہ تم ابھی ہی سوچ سمجھ کر فیصلہ لو'' علی نے بات کے اختتام پر اُسکا چہرہ دیکھا وہ غور سے اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''گول گپے کھاؤ گے؟'' فاطمہ نے انتہائی غیر متوقع سوال کیا تھا۔ اور اُسکا جواب سنے بنا ہی روبی کو آوازیں دینے لگی۔ روبی دو پلیٹوں میں گول گپے سجائے حاضر ہوئی اور اُسے میز پر رکھ کر چلی گئی۔ علی ہکا بکا سا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''مجھے بہت شدید بھوک لگی ہے۔ اور بھوک میں تو مجھے نارمل باتیں سمجھ نہیں آتی تو تم تو پھر بھی۔۔۔'' وہ اپنے پلیٹ میں گول گپے رکھتے ہوئے رکی۔

''میں تو کیا؟''

''تم نے تو پھر بھی اتنی مشکل باتیں کی ہیں۔ پہلے پیٹ میں کچھ چلا جائے پھر تمہاری باتوں کا جواب دیتی ہوں۔ تب تک تم بھی گول گپے لو'' فاطمہ نے اشارہ کیا۔

''نہیں! میں یہ غیر معیاری کھانے نہیں کھاتا'' اُس نے کچھ احتیاط سے کہا۔ فاطمہ کے انداز و اطوار اُسکی سمجھ سے بالاتر تھے۔

''کیا مطلب تم نے کبھی یہ نہیں کھائے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''نہیں۔۔۔'' وہ ایسے شرمندہ ہوا، جیسے یہ کوئی بہت ضروری صلاحیت تھی، جو اُسکے اندر نہ تھی۔

''ایک کھا کر دیکھو، آج پسند نہ آئے تو کہنا'' فاطمہ نے کہا اور اُسکے جواب کا انتظار کیے بنا ہی ایک اور پلیٹ میں گول گپے پر پانی رکھنے لگی۔

''لیکن میں کیسے۔۔۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''لیکن ویکین کچھ نہیں، میزبان جو بھی سامنے رکھ دے کھانا پڑتا ہے'' وہ بضد تھی۔ علی نے مجبوراً پلیٹ اٹھائی اور گول گپا توڑنے لگا ہی تھا کہ وہ چیخ اٹھی۔

''ارے! یہ کیا کر رہے ہیں؟۔۔۔ تم نے تو لگتا ہے واقعی، کبھی یہ نہیں کھائے'' وہ حیرت سے بولی۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔''

''ایسے نہیں کھاتے اسے۔''

''پھر کیسے کھاتے ہیں؟'' وہ جھنجھلا اٹھا۔

''یہ دیکھو ایسے'' فاطمہ نے اپنی پلیٹ سے ایک گپا اٹھایا اور املی والے پانی میں ڈبو کر پورا منہ میں ڈال لیا۔

''ہمم۔۔۔ بہت مزے کا ہے'' وہ گول گپا منہ میں رکھنے کے بعد انگلی اور انگھوٹے کی مدد سے پسندیدگی کا نشان بناتی ہوئی بولی۔ علی حیرت سے مزے لے لے کر گول گپے کھاتی ہوئی فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ہمت کر کے اس نے بھی ایک اٹھایا اور پورا کا پورا منہ میں ڈال لیا۔ دو چار مرتبہ اُسے منہ میں گھمانے کے بعد اُسے اُسکا ذائقہ پسند آیا۔

''نائس!'' اُس نے بیساختہ کہا۔

''اچھا لگا؟'' فاطمہ نے خوشی خوشی پوچھا۔

''ہاں! اتنا برا نہیں ہے ویسے'' اُسے یہ عجیب سی حرکت کر کے مزا آیا تھا۔

''کتنا وقت لگا کھانے میں؟'' اُسکا اگلا سوال اُسکی فرمائش سے بھی کہیں زیادہ غیر متوقع تھا۔

''مطلب؟''

''بتاؤ نہ، کتنا وقت لگا اس کو کھانے میں؟''

''کچھ سیکنڈز''

''اور جتنی دیر میں، میں نے تمہیں قائل کیا، اگر اسکو ملا لو تو کچھ منٹ، ہیں نا؟''

''ہاں!'' وہ اُسکی بے سر و پا باتیں بلکل نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

''بس اتنے ہی منٹ چاہیے ہونگے مجھے روزانہ تم سے ''اُسکی اگلے بات پر وہ بھونچکارہ گیا۔

''بارشوں میں تھوڑے زیادہ، کیونکہ اس میں پکوڑے بنانے پڑیں گے۔اور ہفتے میں ایک بار میٹھے پان۔۔اتنا کافی ہے؟''

''میٹھے پان؟'' وہ حیران ہوا۔

''کیا مطلب؟ تم نے وہ بھی نہیں کھائیں؟'' وہ اُس سے زیادہ حیران ہوئی۔

''تم کھلاؤ گی تو کھالوں گا'' علی نے خود کو کہتے سنا۔ وہ مسکرائی اور اُسی لمحے، علی کو یہ مسکراہٹ دنیا کی سب سے دلفریب شے لگی تھی۔

''یہ جتنا بھی وقت تم نے مجھ سے مانگا ہے، اُسکے علاوہ باقی وقت تم کیا کرو گی؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا انتظار۔۔۔'' بیساختہ جواب دیا گیا، اب کہ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

''کوئی مستقبل کے بارے میں پلانز؟''

''میں جاب وغیرہ نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے؟ مطلب مجھے ایسا لگتا ہے، کہ جب اللہ نے مرد کو میرا کفیل بنایا ہے، تو میں کیوں بلاوجہ کا بوجھ سر پر لوں۔ میں ایک گھریلو قسم کی لڑکی ہوں۔'' اُس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

''وہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔''

''پکا؟ مطلب تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟'' اس نے آنکھیں بڑی کر کے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کیوں اعتراض ہو گا بھلا؟''

''میری سابقہ منگنی اسی بات پر ٹوٹی تھی، اسی لیے تم سے پوچھ لیا''

''سوری؟'' علی کو لگا اُسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ''تمہاری منگنی'' اُس نے تصدیق کرنی چاہی۔

''ہاں! میری، کیوں؟ تمہیں نہیں معلوم؟'' اپنے جواب پر فاطمہ نے اُسکے ماتھے پر بل پڑتے دیکھے تھے۔ اُس نے گہری سانس لیکر پلیٹ میز پر رکھی اور اُسکی طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔

''دیکھو! اگر تمہاری بلاوجہ کی غیرت جاگ رہی ہے ناتواُسے سلادو، کیونکہ وہ میرا ماضی تھا،ایسا ماضی جس میں تم نہیں تھے،اُس کے لیے میں تمہیں جواب دہ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی تمہاری تسلی کیلیئے میں بتادوں، کہ وہ منگنی میرے باپ نے کی تھی اور توڑی میرے دادا نے تھی۔ کیونکہ اگلوں کو مجھ سے زیادہ میری جاب میں دلچسپی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں کما کر اپنا خرچ خود اٹھاؤں اور اُنکے بیٹے کے نخرے بھی۔ خیر،اُس منگنی کے ہونے سے مجھے فرق پڑا تھا نہ ہی ٹوٹنے سے۔ مزید کوئی سوال ہے؟''اُسکے تفصیل سے کہنے پر علی شرمندہ ہوا تھا۔ وہ کب سے اتنا سطحی سوچنے لگا تھا؟اور وہ بھی اس لڑکی کے لیے جس سے ملے کچھ گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔

''میں نے تو کوئی سوال کیا ہی نہیں''اُس نے اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے وضاحت دی۔

''تمہارے ماتھے پر جتنی لکیریں پڑی تھیں نا،اُسکے بعد کسی سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی، تمہیں اپنے تاثرات چھپانے بلکل نہیں آتے۔''وہ بہت ہی آؤٹ سپوکن لڑکی تھی۔اس جواب پر علی کھکھلا کر ہنس دیا۔

''میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں''اُس نے ہنستے ہوئے ہار مان لی۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی علی کا موبائل بج اٹھا۔

''مجھے کافی دیر ہوگئی ہے،اب چلنا چاہیئے۔''وہ موبائل دیکھتے ہوئے اٹھنے لگا۔

''گول گپے تو ختم کرو۔''

''اب تو اگلی دفعہ کھاؤں گا''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جارہے ہو بیٹا؟''اُسے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتا دیکھ کر فاطمہ کی والدہ بھی وہیں چلی آئیں۔

''جی آنٹی! کافی دیر ہوگئی ہے۔ شکریہ آپکا بہت''اُس نے احترام سے جواب دیا۔ وہ اُسے دروازے تک جبکہ فاطمہ اُسے،اُسکی گاڑی تک چھوڑنے آئی تھی۔

''میرا جواب تمہارے والدین تک پہنچ جائے گا''فاطمہ نے اُسکے اندر بیٹھتے ہی شیشے کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تب تک مجھے کیا کرنا ہوگا؟''علی نے پوچھا۔اُسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنا شوخ کیوں ہو رہا تھا۔

''میٹھے پان کھانے کی مشق''اُس نے شرارت سے کہا تو علی ہنس دیا۔ پھر اُسے خدا حافظ کہتا گاڑی لیکر آگے بڑھ گیا۔

---------+---------+---------

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ یہ گرے گا؟'' حسین اس وقت سر کیولر روڈ پر کھڑا تھا، ساتھ میں رضا، مقدّم اور ہمیشہ کی طرح بن بلایا مہمان بنی حور عین۔۔۔

''خود بھی گرے گا اور اپنے آگے پیچھے والوں کو بھی مروائے گا ساتھ'' رضا نے تبصرہ کیا۔ موضوع گفتگو سرکیولر روڈ سے جو بلی تک جانے والی سڑک پر، ون ویلنگ کرتا وہ لڑکا تھا، جس سے اُنکا نہ تو کوئی واسطہ تھا نہ ہی وہ اُسے جانتے تھے۔ بس ایویں۔۔۔ خواہ مخواہ کا شغل۔۔۔

''ایک بار تو گرنا چاہئے اسے، تاکہ عقل ٹھکانے آئے اسکی'' مقدّم نے خواہش ظاہر کی۔

''پتہ نہیں لڑکوں کو کیوں لگتا ہے کہ سگریٹ پینے یا ایسے فضول سے کرتب دکھانے سے لڑکیاں اُن پر مر مٹتی ہوں گی۔'' حور عین نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''تو کیا ایسا نہیں ہے؟'' حسین نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں! بلکہ ایسی اوچھی حرکتیں کرنے والے لڑکوں کو دل میں کئی ہزار گالیوں سے نوازتی ہیں لڑکیاں، پوچھو ہی مت''

''جھوٹ بول رہی ہے یہ'' حسین نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''لڑکی وہ ہے یا تم؟'' رضا کا سوال معقول تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا مقدّم چیخ اٹھا۔

''ارے! وہ دیکھو'' اُسکے اشارہ کرنے پر سب نے سڑک کی جانب دیکھا۔ شیخیاں مارتے لڑکے کی بائیک پھسلی، وہ خود بھی گرا، اور دونوں سڑک پر داستانِ محبت رقم کرتے ہوئے کافی آگے تک گئے، پھر سماج کی دیواروں کی طرح درمیان میں آنے والے درخت نے دونوں کے درمیان ایسی جدائی ڈالی، کہ لڑکا تو وہیں ٹکرا کر رک گیا لیکن اُسکی چہیتی بائیک لڑھکتی ہوئی کافی آگے تک گئی تھی۔

''بہت اچھا ہوا اسکے ساتھ'' حسین، مقدّم اور حور عین ساتھ چیخے تھے۔

''شرم کرو، اس طرح نہیں کہتے'' رضا نے افسوس سے تینوں کو دیکھا۔ تینوں ایک ہی تھالی کے بینگن تھے۔

''کیوں نہیں کہتے؟ اگر آج یہ نہیں گرتا تو کبھی سبق نہ سیکھتا۔ کیا یار مقی؟ کچھ اور نہیں مانگ سکتے تھے؟'' پہلے رضا کو اور پھر مقدّم کو مخاطب کرتے ہوئے حسین نے کہا۔

''قسم سے یار! کوئی دولت شولت ہی مانگ لیتا، فضول میں اپنی دعا ضائع کی'' اُسے بھی واقعی افسوس ہوا۔

''ہمیں اُسکی مدد کرنی چاہیے'' رضا کو احساس ہوا کہ اُسکے پاس اب طلبہ اکھٹے ہو رہے ہیں، تو اُنہیں بھی مدد کرنی چاہیے۔

''یہ اسکے اندر عمر کی روح کیسے جاگ گئی ہے؟'' مقدّم نے حسین کے کندھے پر بازو ٹکاتے، رضا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں مدد کریں؟ مدد کرنا ایسے لوگوں کو شے دینے کے برابر ہے'' حور نے بھی اتفاق کیا تو رضا نے سر جھٹک کر منہ موڑ لیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا اُن سے بحث کرنے کا۔

''اوہ! عمر کی بچھڑی ہوئی روح!'' حسین نے اُسے پُکارا تو اس نے بیزاری سے دیکھا۔

''وہ دیکھو! آ گئی مدد'' اُس نے سرکیولر روڈ کی دوسری جانب اشارہ کیا، جہاں سے رینجرز کے اہلکار آ رہے تھے۔ رینجرز والے اُس لڑکے کی جانب بڑھیں، لڑکا بیچارہ اُٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اُسکے سر پر رسید کیا۔ پھر اُسکی بائیک اور اُسے، دونوں کو ہی حراست میں لے لیا۔

''مل گیا اسکو سبق'' حسین نے کہا۔

''پڑھنے نہیں آتے، تماشا کرنے آتے ہیں'' یہ تبصرہ مقدّم کا تھا۔

''تم گھر کیسے جاؤ گی؟'' حسین یکدم ہی اُسکی طرف مڑا۔

''میں گھر نہیں جا رہی آج، اظہر اور اُسکی امی مجھے پک کریں گے۔ پھر ہم وہاں سے شاپنگ کے لیے جائینگے'' اُس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''ہمم!۔۔۔'' اُس نے بس اتنا ہی کہا۔ ''اور تم؟'' پھر مقدّم کی طرف مڑا۔

''میں بس نکل رہا ہوں، رضا چھوڑے گا آج مجھے'' اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، میں بھی جارہاہوں پھر'' وہ کہتے ہوئے بائیک کی طرف بڑھا۔

''ارے کہاں؟ جب تک اظہر نہیں آجاتا میں اکیلے کیا کروں گی یہاں؟'' اُسے جاتا دیکھ حور عین چیخ اٹھی۔

''اپنے منگیتر کا انتظار'' اُسے منہ چڑاتا ہوا وہ زن سے بائیک لے اُڑا۔

''کتنا بدتمیز ہے یہ؟'' اُس نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، جب تک تم یہاں ہو ہم رک جاتے ہیں'' رضا نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

''اوہ آگیا اظہر!۔۔۔'' کسی گاڑی کو اُسی جانب آتا دیکھ کے وہ بولی۔ ''بہت شکریہ آپکا رضا بھائی! لیکن میں جا ہی رہی ہوں'' وہ اُسکا شکریہ ادا کرتے آگے بڑھ گئی۔

''چلو! ہم بھی چلتے ہیں'' مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ پر اپنی بائیک کھولتے، اُسے سٹارٹ کرتے، اُسکی نظریں تب تک حور عین پر رہیں، جب تک وہ وہاں سے چلی نہ گئی۔

---------+---------+---------

''بس اتنے ہی منٹ چاہیے ہونگے مجھے روزانہ تم سے'' اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر، فائنل امتحان کی تیاری کرتے، علی کے کانوں میں اچانک ہی فاطمہ کی آواز گونجی تو وہ اپنی بیساختہ امڈتی مسکراہٹ کو روک نہ سکا۔

''تمہارا انتظار کرونگی'' اُسکا بیساختگی میں کہا گیا جملہ علی کے کانوں میں رس گھول گیا تھا۔

''تمہیں اپنے تاثرات چھپانے بلکل نہیں آتے'' فاطمہ کے دو دن پہلے کہے گئے جملے، اُسکے چاروں جانب بکھر رہے تھے۔ وہ اُٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کیا واقعی؟ میں بلکل اپنے تاثرات نہیں چھپا پاتا؟'' اُس نے آئینے کے سامنے کھڑے خود سے سوال کیا۔ اگلے ہی لمحے اپنی اس احمقانہ حرکت پر ہنستا ہوا واپس پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''میرا جواب تمہارے والدین تک پہنچ جائیگا'' پتہ نہیں وہ کیا جواب دے؟ کیا معلوم میں اُسے پسند آیا بھی کہ نہیں۔ پہلی بار علی ایسی کسی بات کو لیکر ہلکا سا پریشان ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اُسکی امی چلی آئیں۔

''کیا بات ہے؟ آج تو بڑے خوش لگ رہے ہو؟'' اُنہوں نے اُسکے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا

''نہیں بس، ایسے ہی'' اُس نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں فاطمہ کیسی لگی؟'' اُسکی امی نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔ وہ چند لمحے اُنہیں دیکھتا رہا۔

''وہ اچھی لڑکی ہے، مجھے بہت اچھی لگی'' مختصر سی تعریف دل سے کی گئی تھی۔ اُسکی امی مسکرا دیں۔

''یہ بات میں تمہارے ابّا کو بتانے جا رہی ہوں۔ کچھ دیر میں تم بھی نیچے آجانا۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہوا

''اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم سے تمہارا جواب معلوم کروں، اگر جواب ہاں میں ہو تو پھر وہ ابھی تم سے بات کرینگے۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

کچھ ہی دیر میں علی، سفیر صاحب کے سامنے موجود تھا۔

''تو تم، فاطمہ کے لیے راضی ہو۔'' اُنہوں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''جی'' ماں کی طرح، باپ کے سامنے وہ فاطمہ کیلیئے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔

''یہ اچھی بات ہے۔ فاطمہ نے بھی یہی جواب دیا ہے'' اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس بات نے اُسے خوشی دی تھی۔

''گڈ۔۔'' پتہ نہیں وہ خوش تھے بھی یا نہیں، لیکن انکا لہجہ عجیب سا تھا۔

''تمہاری پڑھائی ختم ہونے میں کتنا وقت ہے؟''

''اگلے ماہ امتحان ہیں''

’’ٹھیک ہے، اگلے ماہ امتحان ہیں۔ شہیر نے شادی کی تیاریوں کے لیے تین ماہ کا وقت مانگا ہے۔ تمہارے امتحان کے دو ماہ بعد ہی تمہاری شادی رکھ لیتے ہے‘‘ وہ بیٹھے بیٹھے منصوبہ ترتیب دے رہے تھے۔ علی کو لگا اُسے سننے میں غلطی ہوئی۔

’’آپ کیا کہہ رہے ہیں ابّا؟ شادی ابھی کیسے ہو سکتی ہے؟‘‘

’’ابھی نہیں تین مہینے بعد‘‘

’’ابّا! میں اس وقت کیسے شادی کر سکتا ہوں؟ مجھے ابھی کیریئر بنانا ہے، اور اپنے بزنس کے لیے پیسے جمع کرنے ہیں۔ اور پھر ابھی تو میرے پاس جاب بھی نہیں ہے۔ سیلز مینیجر والی جاب سے تو بس میرے خرچے پورے ہوتے ہیں۔ شادی ابھی نہیں کر سکتا‘‘ علی نے پریشانی سے بتایا وہ سکون سے سنتے رہے۔

’’تو تم مجھے انکار کر رہے ہو؟‘‘ اُنہوں نے سرد مہری سے پوچھا۔

’’نہیں ابّا! میں انکار نہیں کر رہا۔ میں بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ابھی منگنی کر لیتے ہیں۔ شادی کے لیے مجھے وقت دیں‘‘

’’کتنا وقت؟‘‘

’’کم از کم تین چار سال‘‘

’’شادی تین مہینے بعد ہی ہو گی، ورنہ تم جو مرضی چاہے کرو جیسے ہمیشہ کرتے ہو‘‘

’’آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں، میں اس وقت اتنے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا‘‘

’’شادی کے سارے اخراجات میں اٹھاؤں گا۔‘‘ وہ سمجھ نہیں رہے تھے یا سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔

’’شادی کے بعد بھی ہزاروں اخراجات ہوتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ ایک دوسرے فرد کا خرچ نہیں اٹھا سکتا اور جاب ملنے میں بھی وقت لگے گا‘‘ علی جھنجھلا رہا تھا۔

’’یہ تو تمہیں آرٹس پڑھنے سے پہلے سوچنا تھا‘‘ اُن کے پرسکون لہجے میں کہے گئے جملے نے علی کو اندر تک ساکت کر دیا تھا۔

''اگر تم بزنس پڑھتے تو آج ٹکے ٹکے کی نوکری کرنے کے بجائے، میرے ساتھ آفس جاتے، کام سیکھتے اور امتحانات ختم ہونے کے بعد کمپنی میں اچھے عہدے پر ہوتے۔'' اُنکا ایک ایک لفظ علی کو صدمے اور بے یقینی کے دلدل میں آہستہ آہستہ ڈوبا رہا تھا۔

''تم نے ہی کہا تھا کہ بہت سکوپ ہے اس فضول پڑھائی کا، تو اب مجھ پر ثابت کر کے دکھاؤ۔ اور رہی بات شادی کی تو وہ تو تم تین مہینے بعد ہی کر رہے ہو ورنہ اس بار اپنی مرضی کر کے اپنے باپ کو ہمیشہ کے لیے کھو دو گے۔ اپنا جواب کل تک مجھے پہنچا دینا'' اُسکے کانوں میں قطرہ قطرہ زہر انڈیل کر وہ اٹھے اور علی پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالتے ہوئے جانے کے لیے مڑے، وہ دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے جبکہ صوفے پر بیٹھا علی ہلنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

تم گر بھی رہے ہو گے تو تمہارا باپ تمہیں تھامنے نہیں آئیگا

دو سال پہلے کے کہے اُنکے الفاظ علی کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اُسکے باپ نے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ گرانے والا بھی تمہارا باپ خود ہو گا۔ کمرے میں اِس وقت صرف سفیر صاحب کے دروازے کی جانب اٹھتے قدموں کی آواز تھی۔

علی اُنہیں سلو موشن میں دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ضدی ہیں لیکن اتنے ہیں، یہ بات وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اُسے کامیاب بزنس مین دیکھنا چاہتے تھے تو وہ بھی تو بزنس ہی کرنا چاہتا تھا، لیکن صرف اس لیے کہ اس نے پڑھائی میں فیلڈ اُنکی مرضی کے خلاف چنی تھی، وہ اب مکمل طور پر اُسے سزا دینا چاہتے تھے۔ علی جو کہ سمجھ رہا تھا کہ سزا تو وہ دو سال سے اپنے باپ کی ناراضگی کی صورت میں بھگت رہا تھا، وہ غلط تھا۔ سزا تو اب شروع ہونے جا رہی تھی۔

میں جاب وغیرہ نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے؟ مطلب مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب اللہ نے مرد کو میرا کفیل بنایا ہے تو میں کیوں بلاوجہ کا بوجھ سر پر لوں۔ میں ایک گھریلو قسم کی لڑکی ہوں۔

فاطمہ کے الفاظ اُسے یاد آئیں تھے۔ سفیر صاحب دروازے سے تھوڑے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اُسے اب سمجھ آرہا تھی کہ اُسکے باپ نے فاطمہ کا انتخاب ہی کیوں کیا تھا؟ وہ ہر جانب سے اُسکے راستے بند کرنا چاہتے تھے۔

تمہارے کسی بھی آئیڈیا یا بزنس پلان میں، میں ہرگز انویسٹ نہیں کروں گا

سفیر صاحب دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ رہے تھے۔ وہ اُسے گھٹنوں پر گرانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ علی ہر روز اپنے فیصلے پر شرمندہ ہو، پچھتائے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ ہی غلط تھا۔

''ابّا!'' وہ دروازہ کھول کر باہر قدم رکھنا چاہتے ہی تھے کہ علی کی آواز پیچھے سے سنائی دی۔ فرش پر نِگاہیں ٹکائے وہ اُنہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔

''میں شادی کے لیے تیار ہوں''

---------+---------+---------

''میں تو سمجھتا تھا کہ مڈل چائلڈ ہونا برا ہے، لیکن یہاں تو اکلوتے ہونے کی سزا بھی کافی زیادہ ہے'' نوید نے پر مزاح انداز میں کہا تھا۔

''نہ تو مڈل چائلڈ، نہ اکلوتا اور نہ ہی بڑا بچہ سزا بھگتے، اگر جو والدین مساوات قائم رکھیں'' علی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ پوری رات اُسکی کانٹوں پر گزر گئی تھی، جب پریشانی حد سے زیادہ بڑی تو صبح نوید سے ملنے چلا آیا۔ ابھی دونوں ہی ڈی ایم ایس کیفے میں بیٹھے تھے۔ جامع میں یہ واحد کینٹین تھی جو کسی چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے طرز پر بنی تھی، یہاں کی قیمتیں بھی آسمانوں سے باتیں کرتی تھیں۔ وہ شاید ہی کبھی بھولے بھٹکے سے اِدھر آتے ہوں۔ ابھی علی کو سکون چاہیے تھا، وہ خاموشی میں بیٹھ کر نوید سے بات کرنا چاہتا تھا، اسی لیے، اُسے ساتھ لیے یہیں چلا آیا۔ باقی کینٹینز کی نسبت یہاں کم ہی رش ہوتا تھا۔

''میں اس معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' نوید نے اس بار سنجیدگی سے پوچھا۔ نوید کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی اُسکے سامنے بیٹھ کر رو بھی رہا ہو، تو وہ بس منہ دیکھنے پر اکتفا کرتا، یا پھر کندھے اچکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا، اور ایسا اس لیے تھا کہ اُسے نہ ہی تسلّی دینا آتی تھی نہ حوصلہ، اُسکا آدھا وقت تو یہی سوچنے میں نکل جاتا تھا کہ اُسے اس صورتحال میں کرنا کیا چاہیے؟

خود چہرے پر پریشانی لاتا تو اُسے لگتا کہ کہیں اُسے پریشان دیکھ کر سامنے والا مزید پریشان نہ ہو جائے، پریشانی نہیں لاتا تو لگتا کہ کہیں سامنے والا اُسے بے حس نہ سمجھنے لگ جائے، روتے ہوئے کو ہنسانا بھی اُسے عجیب لگتا تھا۔ بلآخر وہ یہی فیصلہ کرتا کہ جو رو رہا ہے یا پریشان ہو رہا ہے، اُسے اُسکا شغل جاری رکھنے دو، جب وہ فارغ ہو جائے گا تو پھر اُس سے کسی مسئلے پر بات کرینگے۔

''تم کیا کر سکتے ہو بھلا؟ جو کرنا ہے مجھے خود ہی کرنا ہے۔ لیکن کیسے کرنا ہے یہ سمجھ نہیں آ رہا''

''تم نے خود کیا سوچا ہے؟''

''سوچا تو تھا کہ رات والی نوکری چھوڑ دونگا اور صبح اپنی فیلڈ کے حساب سے نوکری کرونگا لیکن اب تو لگ رہا ہے کہ دونوں نوکری کرنی ہو گی''

''ایک تنخواہ میں بھی دو لوگوں کا گزارہ ہو سکتا ہے۔ تم اپنے آپ کو بلاوجہ پریشانی میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

''ہاں! گزارا تو ساری زندگی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے کیریئر کا کیا؟ میرے خوابوں کا اور میرے اُس بزنس پلان کا کیا؟ جسکے لیے میں یہ ساری محنت کرنا چاہتا تھا۔ ابھی میں شادی کرنے کا متحمل نہیں تھا لیکن اب ابّا نے میرے لیے سارے دروازے بند کر دیئے ہیں''

''تو پھر جب تم نے ابّا کا فیصلہ بھی مان لیا ہے اور اپنے خواب بھی پورے کرنا چاہتے ہو تو محنت بھی تمھیں ہی کرنا ہو گی۔'' بنا جذباتی ہوئے، حقیقت پسندانہ انداز میں بات کرنا نوید کا ٹریڈ مارک تھا۔

''میں محنت سے نہیں گھبرا رہا، بس ابّا کے رویے سے دکھی ہوں۔ جو کام میں دس سال میں کر سکتا تھا، اب اُسکے لیے مجھے بیس سال درکار ہوں گے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ ابّا کے پیسوں میں میرا بھی حق ہے۔ کبھی بھی ضرورت ہو گی تو اُن سے مانگ سکتا ہوں لیکن انہوں نے وہ راستہ بھی بند کر دیا۔'' وہ سخت دکھی تھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی

''میرے پاس تو ایک ہی مشورہ ہے'' کافی دیر بعد نوید نے کہا

''کیا؟''

''تم اُس لڑکی سے بات کرو''

''کس لڑکی سے؟''

''جس سے تمہاری شادی ہونی ہے۔ ابھی نہیں تو بعد میں کر لینا۔ کیوں کہ آگے جتنے بھی مسئلے ہونے ہیں تم دونوں نے ہی برداشت کرنے ہیں۔ تو اُسکے ساتھ کی تمھیں زیادہ ضرورت ہو گی۔ تم اُسے اپنے مستقبل کے بارے میں خبردار کر سکتے ہو'' نوید نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اُسے کچھ سمجھانا چاہا۔ علی نے نفی میں سر ہلایا

''تم چاہتے ہو کہ میں ابّا کو انکار کروانے کے لئے اُسکا استعمال کروں؟ جب میں خود اپنے باپ کو انکار نہیں کر سکا تو ایک لڑکی کو کیسے کہوں ایسا کرنے کو؟ اور میں کیا بات کروں اُس سے؟ تم نے ابھی خود کہا کہ دو لوگوں کا خرچہ تو باآسانی پورا ہو سکتا ہے، تو پھر میں کیا کہوں گا اُس سے؟ یہ کہ میرے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے تم بھی نوکری شروع کر دو جبکہ وہ مجھ سے کہہ چکی ہے کہ وہ مرد کو اپنا کفیل سمجھتی ہے اور خود نوکری نہیں کرنا چاہتی۔ اتنی خود غرض حرکت نہیں کر سکتا میں''

''تم اس سے کب ملے؟'' ساری باتوں میں نوید نے بس یہی بات سنی تھی جیسے۔

''کچھ دن پہلے، ابّا نے کہا تھا اسی لیے'' اُس نے عام سے انداز میں کہا۔

''آخری حل یہ ہے کہ تم یا تو اپنے ابّا سے معافی مانگ کر اُنکا بزنس جوائن کر لو، یا پھر انکو راضی کرنے کی کوشش کرو''

''دونوں صورتیں ناممکن ہیں''

''ایسا نہیں ہے، باپ ہیں تمہارے، مان جائینگے۔ کوشش کرو کہ وہ تمہارا بزنس پلان سن لیں ایک بار'' نوید اس سے زیادہ کہہ بھی کیا سکتا تھا بھلا؟

''ابھی تم امتحانات پر توجہ دو، ساتھ میں نوکری کی تلاش بھی جاری رکھو پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے''

''ہمم۔۔۔ صحیح کہہ رہے ہو'' علی نے اتنا ہی کہا بس۔ گو کہ نوید نے اُسے کوئی قابلِ ذکر تسلی یا مشورہ نہیں دیا تھا لیکن اُس سے بات کر کے علی کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی باقیوں کی نسبت اس سے زیادہ قریب تھا۔ نوید اُسے کہتا تھا کہ ''تم میرا ہی ایک حصہ ہو''

فاطمہ اور اپنی شادی کے حوالے سے بھی اُس نے صرف نوید کو ہی بتایا تھا۔ باقی سب کو وہ مقدم کے نکاح پر بتانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ البتہ ایک بات جو اُس نے نوید کو بھی نہیں بتائی وہ یہ تھی کہ فاطمہ کو انکار نہ کرنے میں اُسکی اپنی مرضی بھی شامل تھی۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو علی کو پسند آئی تھی۔

بس اتنے ہی منٹ چاہیے ہونگے مجھے روزانہ تم سے، بارشوں میں تھوڑے زیادہ، کیونکہ اس میں پکوڑے بنانے پڑیں گے۔ اور ہفتے میں ایک بار میٹھے پان۔۔۔ اتنا کافی ہے؟

فاطمہ کے الفاظ کانوں میں گونجے تو چہرہ متبسم ہو گیا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو اُسے پسند آئی تھی۔ اور وہی آخری ہونے والی تھی، کیونکہ اسکے بعد اُسکا عورت نامی مخلوق سے اعتبار اٹھنے والا تھا۔ اُسکو اپنا مستقبل روشن نہ صحیح لیکن فاطمہ کے ساتھ خوبصورت ضرور نظر آرہا تھا۔ لیکن نظریں وہی دکھاتی ہیں جو ہمارا دل ہمیں دکھانا چاہتا ہے۔

کیونکہ

دل کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔۔۔

---------+---------+---------

امتحانات ختم ہوتے ہی مقدم کا نکاح تھا، جسکے اگلے دن وہ اُسکے ساتھ ریسٹورونٹ کی پر تعیش فضا میں بیٹھے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ دعوت آج مقدم کی طرف سے ہی تھی۔ اندر جانے کے بجائے، اُنہوں نے اوپن ایئر ایریا میں رکھے شاہی طرز کے تخت پر بیٹھنا زیادہ پسند کیا تھا۔

''یہ دعوت میرے شایانِ شان نہیں ہے۔'' حسین نے اعلان کیا تھا۔

''بلکل، حالانکہ تم گھر پر ٹینڈے اور چاول کھانے کے لائق ہو، لیکن چونکہ میں اپنے دوستوں کے درمیان مساوات قائم رکھنا چاہتا ہوں، اسی لیے تمہیں بھی یہاں لے آیا'' مقدم نے سٹارٹر سے انصاف کرتے ہوئے مزے سے کہا۔

''میں گھر کے ٹینڈے اور دال چاول کھانے کو تیار ہوں بشرطیکہ گھر تمہارا سوات والا ہو'' حسین نے جواب دیا۔

''اور وہ تمہاری شرط کیوں مانے؟'' عمر نے پوچھا۔

''بات میں اس سے کرتا ہوں تکلیف تمہیں کیوں پہنچتی ہے؟'' حسین نے چڑ کر عمر سے پوچھا۔

''کیونکہ وہ میرا جگر ہے'' عمر نے چڑایا۔

''اور ہم کیا ہیں؟ دل، گردے یا پھیپھڑے؟'' نوید نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''نہیں تم تو ہاتھ کی چھٹی انگلی کی طرح ہو، کاٹ بھی نہیں سکتا اور ساتھ رکھ بھی نہیں سکتا'' حسین نے جواب دینے کے بعد داد طلب نظروں سے سب کو دیکھا۔ کسی نے بھی داد دینا ضروری نہ سمجھا۔

''اتنی لمبی تو صرف آنتیں ہو سکتی ہیں'' مقدّم نے اُسکے لمبے قد پر چوٹ کی۔ وہ بیٹھا ہونے کے باوجود بھی دور سے نظر آجاتا تھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں واقعی گھومنے پھرنے جانا چاہیے، چھ سال ہم نے صرف پڑھنے میں ہی گزار دیے ہیں۔ آگے عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ایک بار تو ہمیں کہیں ساتھ جانا چاہیے'' عمر نے کہا تو نوید نے زور و شور سے اُسکی تائید کی تھی۔ باقی سب بھی راضی نظر آرہے تھے۔

''یہی بات میں بھی کہہ رہا تھا، لیکن تم لوگوں کو میری بات کبھی پسند ہی نہیں آتی'' حسین نے منہ بنایا اور ایک مرتبہ پھر اُسے نظر انداز کیا گیا تھا۔

''میں راضی ہوں، شمالی علاقہ جات چلتے ہیں۔'' مقدّم نے کہا، اب کہ وہ بھی سنجیدہ نظر آتا تھا۔

''میں بھی'' عمر نے کہا۔

''میں بھی اور یہ دونوں بھی۔۔۔'' نوید نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دائیں بائیں بیٹھے علی اور حسین کا ہاتھ اٹھا دیا۔

''السلام و علیکم!'' اُسی لمحے رضا وہاں آیا تھا۔ ٹیبل پر موجود حسین اور عمر کے علاوہ سب ہی نے اُسے گھور کر دیکھا تھا۔

''سٹارٹر ختم ہونے کے بعد پہنچ رہے ہو تم؟'' مقدّم نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سوری! میں بھول گیا تھا کہ یہاں آنا ہے۔ جب یاد آیا تو فوراً ہی نکل گیا'' اُس نے سنجیدگی سے وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں تم اپنا مین کورس بھی رضا کو دے دینا'' حسین نے مقدّم کو مفت مشورے سے نوازا تھا۔

''میں تو تمہارا والا اِسکو دینے کا ارادہ رکھتا تھا'' مقدّم نے جواب دیا۔

''تمہاری یاداشت کو کیا ہو گیا ہے بیٹا؟'' بہت دیر سے خاموش بیٹھے علی نے رضا کی آخری بات پر اُس سے پوچھا۔

''اُسکی یاداشت کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' رضا کے جواب دینے سے پہلے ہی حسین نے علی کی بات اُچک لی۔

''مجھے کیا ہونا ہے؟''علی حیران ہوا۔

''یہ جو تم کھوئے کھوئے بیٹھے ہو اور اچانک اچانک مسکرانے لگتے ہو، راز کیا ہے؟'' بات شروع حسین نے کی تھی پر مکمل مقدّم نے کی تھی۔

''راز نہیں، مجھے نفسیاتی بیماری لگتی ہے''، حسین نے علی کو جواب دینے نہیں دیا۔

''ویسے تو تم دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، لیکن جہاں دوسروں کی ٹانگیں کھینچنے کا وقت آجاتا ہے، دونوں ایک ہو جاتے ہو''عمر نے ایک دم سے اُنکے پارٹی بدلنے پر چوٹ کی تھی۔

''دیکھ مقی! تیرا جگر ہمیں مفاد پرست کہہ رہا ہے''، حسین نے مقدّم کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اوں ہوں۔۔''اُس نے نفی میں سر ہلایا''مفاد پرست نہیں، موقع پرست کہہ رہا ہے ہمیں''، پھر تصیح کی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے رضا؟''نوید نے خاموش بیٹھے رضا سے پوچھا۔ کافی دنوں سے غائب رہنے کے بعد جب وہ آیا تھا تو اس نے اُنہیں یہی بتایا تھا کہ وہ بیمار تھا۔

''بہتر ہے''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''پھر اتنے چپ کیوں بیٹھے ہو؟''

''یہ دونوں کچھ بولنے دینگے تو بولے گا نہ''عمر نے جواب دیا۔

''لو بھلا ہم نے کونسا اُسکے بولنے پر ٹیکس لگایا ہے'' مقدّم برا مانتے ہوئے بولا۔ اُن لوگوں کی زبانیں بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

''چپ کر جاؤ خدا کے واسطے۔۔''نوید نے زِچ ہوتے ہوئے کہا، پھر دوبارہ رضا کی جانب متوجہ ہوا''تم اتنے بیمار تھے تو ہم میں سے کسی کو بتا دیتے، تم ویسے ہی اکیلے رہتے ہو، پتہ نہیں اپنا خیال کیسے رکھ رہے ہو گے۔ ہوا کیا تھا تمہیں؟''نوید نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ایسی بھی بڑی بات نہیں تھی، بس بخار تھا اور اتنی سی بات کے لیے کیا تنگ کرتا تم لوگوں کو؟ اب بہتر ہوں۔ الحمداللہ!'' اُس نے آہستہ آواز میں کہا، اُسکا گلا ابھی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ آواز نکلنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''خیر مجھے تو اب بھی بہتر نہیں لگ رہے'' نوید رضامند نہیں لگتا تھا۔

''بہتری آجائے گی طبیعت میں جب ہم شمالی علاقہ جات جائینگے'' حسین نے کہا۔ اور کسی نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر عمر نے دیکھا تھا کہ حسین نے ایک بار پھر واضح طور پر موضوع بدلا تھا، اور ایسا وہ بار بار صرف تب ہی کر رہا تھا، جب بھی کوئی رضا سے سوال جواب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا مطلب تم سب سنجیدہ ہو؟'' مقدّم نے حیرت سے پوچھا۔ وہ سمجھا تھا کہ شمالی علاقی جات جانے والی بات، وہ لوگ ازراہ مذاق کر رہے ہیں۔

''میں تو بلکل ہوں'' نوید نے جواب دیا۔

''مقّی ہمیں اپنے گھر نہیں بلانا چاہتا'' حسین نے دکھی ہونے کی اداکاری کی۔

''صرف تمہیں۔۔'' مقدّم نے تصیح کی۔

''تو کب جانا ہے؟'' نوید نے اُنہیں پھر سے غیر سنجیدہ ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں اگلے ماہ چلتے ہیں۔ اور کون کون سی جگہ دیکھنی ہے، اِسکا فیصلہ مقدّم کرے گا کیونکہ یہ اُن علاقوں کو بہتر جانتا ہے'' عمر نے کہا۔ کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا رضا کے علاوہ سب ہی نے اپنی پلیٹوں میں کھانا لینا شروع کر دیا تھا۔

''تم کیوں نہیں لے رہے؟'' علی نے اسکو ٹیک لگائے بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

''لیتا ہوں'' پھر مختصر سا جواب۔

''اگلے مہینے نہیں، اُسکے اگلے مہینے بھی نہیں اور اُسکے اگلے دو مہینے بھی نہیں'' نوید نے اچانک ہی کہا۔ رضا نے پلیٹ میں چند چمچ چاول نکالے اور اب اُنہیں چمچ کی مدد سے بس یہاں وہاں ہلا رہا تھا۔ منہ میں اس نے اب تک ایک لقمہ بھی نہ ڈالا تھا۔

''کیوں بھئی ؟ابھی تو بہت اچھل رہے تھے جانے کے لئے ؟'' حسین بدمزہ ہوا۔

''کیوں کہ اگلے چھ مہینے تک تو علی کہیں نہیں جانے والااور یہ نہیں جائے گاتو میں بھی نہیں جاؤں گا''نوید نے اعلان کیا۔

''کیوں علی تمہاری بیوی ہے جواُسکے بنا تمہارا گزرا نہیں ؟'' حسین نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم کھا کیوں نہیں رہے رضا؟''اُنکی باتوں سے بے نیاز علی کی نظریں رضا پر ہی تھیں۔

''طبیعت کچھ عجیب سی ہے، ٹھیک سے کھایا نہیں جارہا''اُس نے آہستہ لہجے میں کہتے ہوئے پلیٹ پرے کی۔

''تو تمہارے لیے کچھ ہلکا پھلکا منگوا لیتے ہیں'' علی کو اس پر ترس آیا تھا۔

''بیوی کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ علی کیوں نہیں جائے گا؟'' مقدّم حسین سے زیادہ مشکوک ہوا۔

''اسکی شادی ہے نا اگلے مہینے''اس سے پہلے کے رضا، علی کو کوئی جواب دیتا نوید کی بات پر وہ جھٹکے سے اُنکی جانب مڑا تھا۔ باقی سب نے اس بات کو مذاق کے پیرائے میں ہی لیا تھا۔

''ارے ہاں ! میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ میری شادی ہے دو مہینے بعد''اُس نے جتنے آرام سے بم پھوڑا تھا، اتنی ہی تیزی سے وہاں سب کو سانپ سونگھا تھا۔ مقدّم تو باقاعدہ منہ میں چمچ ڈال کر نکالنا ہی بھول گیا تھا۔

''ایسے مت دیکھو مجھے، میں بتانے ہی والا تھا'' وہ گڑبڑایا۔

''ہاں ! اس بیچارے کو تو خود ایک مہینے پہلے پتہ چلا ہے''اب کہ نوید نے دوسرا بم پھوڑا تھا۔ علی نے اسکو کُہنی مارنی چاہی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ سب شدید صدمے کے عالم میں اُسے دیکھ رہے تھے۔

''تمہیں پتہ تھا؟''سب سے پہلے حسین کا سکتا ٹوٹا، تو اس نے سنجیدگی سے نوید سے پوچھا۔ اُس نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا کر کھانا کھانا شروع کر دیا جیسے یہی دنیا کا سب سے ضروری کام ہو۔

''تمہیں پتہ تھا؟''اب کہ اس نے مقدّم سے پوچھا۔ اُس نے منہ سے چمچ واپس نکال کے انتہائی دکھ سے نفی میں سر ہلایا۔ گھورتی نظریں علی پر ہی ٹکی تھیں۔

''اور تمہیں؟''اب کہ وہ عمر کی جانب متوجہ ہوا۔اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

''لعنت بھیجتا ہوں میں ایسی دوستی پر جہاں صرف ایک کو معلوم ہے اور باقیوں کو رشتے داروں کے طرح اطلاع دی جارہی ہے''حسین نے ملکہ جذبات بنتے ہوئے کہا۔ باقی سب علی کو گھور رہے تھے اور وہ پوری دلجمعی سے کھانا کھاتے نوید کو، رضا اس پوری صورتحال پر بس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

''میں نے اپنے امّاں ابّا کو راضی کرنے سے لیکر بات پکی ہونے تک،اور وہاں سے آگے نکاح ہونے تک ایک ایک عمل، تم سب کو بتایا،اور دیکھو ذرا اس بیغیرت انسان کو''مقدّم نے تو شدت غم سے کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

''اور وہ ساری باتیں ہم نے کتنی بیزاری سے اور کس قدر حالت مجبوری میں سنی تھی یہ ہم سے پوچھو،بس اسی تکلیف سے تم سب کو بچانا چاہا تھا میں نے''علی بھی ڈھٹائی سے بولا تھا۔

''چھوڑ دو اس بے شرم آدمی کو مقّی! ہم چاروں اسکی شادی پر جانے کے بجائے شمالی علاقہ جات ہی جائینگے''حسین نے اُسے گھورتے ہوئے،اُسکی سزا تجویز کی۔

''چاروں سے تمہاری مراد؟''نوید کے کان کھڑے ہوئے۔

''چاروں سے اسکی مراد تم تو بلکل نہیں ہو''مقدّم ٹھیک ٹھاک تپا ہوا تھا۔

''اُسکو وضاحت دینے کا موقع تو دو''عمر کے اندر کا ہمدرد انسان ہمیشہ کی طرح جاگ گیا تھا۔

''ہمیں کوئی وضاحت نہیں سننی''مقدم کچھ سننے پر رضامند ہی نہیں تھا۔

''میں دے بھی نہیں رہا''علی بھی انکو خاطر میں نہیں لارہا تھا۔

''تم لوگوں کی اوور ایکٹنگ ختم ہو گئی ہو تو اُسکی بات بھی سن لو''عمر نے ایک مرتبہ پھر اُن دونوں کو لتاڑا تھا۔

''دیکھو رضا اور عمر!''علی نے صرف اُن دونوں کو مخاطب کیا۔

''میرے ابّا مجھ سے دو سال سے ناراض تھے، اب اُنہوں نے مجھے خود بلا کر مجھ سے بات کی اور کہا کہ انہوں میں میرے لیے لڑکی پسند کی ہے اور وہ امتحانات کے دو ماہ بعد میری شادی کروانا چاہتے ہیں تو میں کیسے منع کرتا؟ اور تم لوگوں کو اس لیے نہیں بتا سکا کیونکہ مجھے خود تین سے چار ہفتوں پہلے یہ بات معلوم ہوئی، تو میں تم لوگوں کو کیسے بتاتا؟''اُس نے صرف اور صرف ان دونوں سے ہی بات کی تھی۔

''جیسے نوید کو بتایا تھا''حسین چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

''آغا کا نکاح تھا ناں یار درمیان میں، اسی لیے نہیں بتایا ہوگا''عمر نے اُسکی طرفداری کرنے کی کوشش کی۔

''بہت ہی بھونڈا بہانہ ہے''مقدم نے یہ بہانہ بھی رد کیا۔

''دیکھو! میرا کوئی بھائی ہے نہیں، اور کزن بھی کوئی نہیں لہٰذا اب تم تینوں نے ہی میری مدد کرنی ہے''علی نے ان دونوں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالا تھا۔

''اور یہ دو لوگ نہیں آرہے کیا؟''عمر نے اشارے سے پوچھا۔

''یہ دو لوگ تو شمالی علاقہ جات نہیں جارہے کیا؟''اُس نے دوبدو جواب دیا۔

''صرف ہم دو نہیں، پلان سب کا تھا خصوصی طور پر اس بھائی کا''مقدّم نے انگلی سے نوید کی جانب اشارہ کیا۔

''میں نہیں جارہا''اُس نے سب سے پہلے یوٹرن لیا۔

''میں بھی نہیں جارہا''مقدّم کے لاکھ گھورنے کے باوجود عمر نے بھی بیان بدلا۔

''تمہاری کیا رائے ہے؟''اب کہ حسین نے رضا کو بھی گفتگو میں گھسیٹا تھا۔

''میرے پاس فضول پیسے نہیں ہے برباد کرنے کو لہٰذا میں شادی میں ہی آرہا ہوں''اُس نے بھی ہری جھنڈی دکھائی۔

''ویسے پیسے تو ابھی میرے پاس بھی نہیں ہے''نوید کو ایک اور بہانہ یاد آیا۔

''تمہیں پیسوں کی ضرورت ہی کہاں ہے؟ تم اپنا ایک قدم ہی بڑھالو تو اگلے شہر میں ہوگے۔''حسین نے اُسکے قد کو نشانہ بنایا تھا۔

’’اب جبکہ سب کا یہی ارادہ ہے تو میں بھی علی کو معاف کرتے ہوئے شادی میں آنے کو تیار ہوں‘‘ مقدم نے اچانک ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تو اس غدّاری پر حسین نے زوردار تھپڑ اُسکے کندھوں پر جڑا تھا۔

’’حالانکہ آنا تم لوگوں نے میری شادی میں ہی ہے۔ لیکن فضول کے ڈرامے کرنا ضروری ہے‘‘ علی نے بیزار ہوتے ہوئے کہا تھا۔ حسین ابھی تک روٹھا بیٹھا تھا۔

’’چلو یار پریشان نہ ہو، ہم یہ گھومنے کا منصوبہ دو چار مہینے بعد بنالینگے‘‘ علی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

’’رہنے دو، جنکی شادیاں ہو جاتی ہیں نا پھر وہ کبھی نہیں ملتے۔ یہ بھی تم آج آخری بار ہمارے ساتھ بیٹھ رہے ہو‘‘

’’تمہیں بڑا تجربہ ہے؟‘‘

’’ایسا کچھ نہیں ہوتا، میرا ابھی تو کل ہی نکاح ہوا ہے، دیکھ لو تم سب کے ساتھ ہوں‘‘ مقدم نے فخر سے اپنی مثال دی۔

’’وہ تو لیلیٰ اپنے گاؤں چلی گئی ہے آج صبح ہی، اسی لیے تم یہاں ہو‘‘ عمر نے دو منٹ میں اُسکا سارا فخر نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیا۔

’’ختم کرو اس موضوع کو اب، ہم سب اس عید کے بعد چلیں گے‘‘ اب علی کو حقیقتاً غصّہ آگیا تھا۔ لہٰذا سب نے فوراً سے حامی بھری اور انسان بن کر بیٹھ گئے پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

’’تو اُسکی نفسیاتی بیماری کی وجہ یہ تھی‘‘ بلکل اچانک ہی حسین نے کہا تو وہاں قہقہ پڑا تھا۔ علی نے دانت کچکچاتے ہوئے اُسے دیکھا تھا۔ نوید شادی کی تیاریوں پر بات کر رہا تھا، عمر رضا کو تھوڑی دیر پہلے حسین کی ماری گئی جگت کا مطلب سمجھا رہا تھا، جسے سمجھ کر وہ سر ہلا رہا تھا، مقدّم شمالی علاقے جانے کے سارے منصوبے ابھی سے طے کر رہا تھا۔

فضاء خوشگوار تھی، دوستی مضبوط تھی اور خوشیاں منتظر۔

لیکن ایسا دائمی تو نہیں رہنے والا تھا۔۔۔

وہ دوبارہ ایسے اکھٹے ہونے والے تھے۔۔۔

لیکن ایسے نہیں، اس مقام پر نہیں اور اِن حالات میں نہیں۔۔۔

قسمت میں اُنکا ایک ساتھ شمالی علاقہ جانا لکھا تھا۔

لیکن ابھی نہیں۔۔۔

اُنہیں نہیں معلوم تھا کہ کسی اور وقت پر، کسی اور لمحے میں، اُنکی یہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔۔۔

لیکن تب نہ وہ ایک دوسرے کے دوست رہنے والے تھا نہ انکو ایسے کسی سفر کی خواہش رہنے والی تھی۔۔۔۔

ایک منصوبہ اُنہوں نے بنایا تھا اور ایک منصوبہ قدرت نے۔۔۔۔

---------+---------+---------

آج وہ اُسکے سامنے تھا۔ کالے رنگ کے سوٹ پر سلیقے سے سیٹ کیے گھنے بالوں اور چہرے پر چھائے سخت تاثرات کے ساتھ۔

بلکہ آج وہ سب ساتھ تھے۔ یہ وہی لوگ تھے، جو ساتھ ہوتے تھے تو ایک دوسرے کو خاموش کروانے کے لیے باقاعدہ ہاتھ جوڑنے پڑتے تھے اور آج چار لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی کمرے میں موت جیسا سنّاٹا تھا۔

علی نے بلآخر وہ کاروبار بنالیا تھا جسکا اُس نے خواب دیکھا تھا، پھر اُسکے چہرے پر خوشی کیوں نہ تھی؟ اور رضا کو سامنے دیکھ کر تو اسکے اعصاب ایسے تن گئے تھے جیسے کوئی پرانا دشمن سامنے آبیٹھا ہو۔ رضا نے اخلاقاً تو دور انسانی تجسس کے طور پر بھی کسی کی جانب دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔

مقدّم کچھ نہیں جانتا تھا کہ اُسکے پیچھے کیا ہوا تھا؟ لیکن کچھ تو ہوا تھا۔ کچھ ایسا جس نے اُن سب کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے بھی روادار نہ تھے۔

مقدّم جتنا سوچ رہا تھا اتنا الجھ رہا تھا۔ اپنے یہاں ہونے، ایف آئی اے کا اُسے یہاں بلانے سے زیادہ حیرت انگیز اُسکے لیے اُنکا رویّہ تھا۔

کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ کوئی اِسی جانب آرہا تھا۔ آنے والے نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھے۔ جینز پر کالی شرٹ پہنے وہ لڑکا، ڈیل ڈول سے کوئی فوجی لگتا تھا۔ مقدم اُسے پہچان گیا۔ دو دن پہلے یہی لڑکا اُسکے گھر آیا تھا۔ خیر سے کیا بھلا نام تھا اُسکا؟ مقدّم نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''السلام علیکم! میں اے ایس پی شیراز ہوں۔ ڈی آئی جی صاحب آ چکے ہیں۔ وہ آپ سب کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔''اُس نے رک کر اُنکا چہرہ دیکھا۔ جہاں بے چینی ہی بے چینی پھیلی تھی۔

''آپ سب کو میرے ساتھ آنا ہو گا''اُس نے کہا تو وہ چاروں اُٹھ کر کھڑے ہوئے لیکن اُنہیں حیرت کا شدید جھٹکا تب لگا، جب شیراز باہر جانے کے بجائے پورا کا پورا گول کمرے کے اندر آیا اور رضا کی جانب بڑھتے، اُسکے سامنے آ کر رکا۔ وہ نا سمجھی سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ذرا جگہ دیجیئے گا''اُس نے اُس کے پاس پہنچ کر کہا تو وہ عجلت میں دوسری طرف ہوا۔ شیراز دیوار کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے اُس نے دیوار کے برابر میں موجود آلے پر کچھ لکھا۔ اور اُن سب نے اپنی آنکھوں سے دیوار کو سلائڈ ہو کر جگہ سے ہٹتے دیکھا تھا۔

''آپ لوگ میرے پیچھے آیئے''شیراز نے اُن کے حیران پریشان چہروں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ دیوار کی جگہ اب نیچے کی جانب اُترتی سیڑھیوں نے لے لی تھی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھے کہ انہیں جانا چاہیے یا نہیں؟ کیونکہ آج کے دن میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اُنکے اعصاب پر بھاری تھا۔

''آجایئے! کیونکہ آگے آپ جن حالات کا سامنا کرنے والے وہ اس سے زیادہ اعصاب شکن اور شاک پہنچانے والے ہوں گے''شیراز گویا اُنکے چہرے پڑھ رہا تھا۔

''یقین مانیے، ایف آئی اے آپکی زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ یہ جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں، آپکی زندگیوں کی سلامتی کے لیے ہی ہے''اُس نے نرمی سے کہا۔

''اب آپ لوگ میرے پیچھے آیئے'' یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اترنے کے لیے مڑ گیا۔ اُسکے پیچھے سب سے پہلے قدم رضا نے ہی بڑھائے تھے، بنا کسی کی بھی جانب دیکھے۔ پھر باقی سب بھی باری باری اُسکے پیچھے آ گئے۔

---------+---------+---------

سیڑھیاں ختم ہونے کے بعد ایک پورا جہان تھا جو شروع ہو رہا، سفید روشنیوں میں نہایا وہ پورا فلور لکڑی سے بنا تھا۔ مختلف کمروں میں ایف آئی اے کے ملازمین کام کرتے نظر آ رہے تھے، کہیں چھوٹے چھوٹے کیبنز میں مختلف لوگ کاغذات میں سر دیے بیٹھے تھے۔ لوگ مختلف سمتوں سے آ جا رہے تھے۔

وہ چاروں شیراز کے پیچھے چل رہے تھے۔ایک دروازے کے سامنے شیراز رکا۔دروازے کے اوپر محکمہ مشاہدہ لکھا ہوا تھا۔

یہاں بھی دیوار پر ایک آلہ لگا تھی، جس پر شیراز نے اپنا کارڈ رکھا، تو وہ دروازہ سلائیڈ ہوتے ہوئے اپنی جگہ سے ہٹا۔ شیراز اُنہیں لیکر اندر داخل ہوا۔

کمرے کے اندر روشنیاں مدھم تھیں۔ کمرہ کیا تھا، وہ پورا ایک آفس تھا، جسکے کناروں پر مختلف سسٹمز رکھے تھے۔ہر سسٹمز کے سامنے کوئی نہ کوئی بیٹھا سنجیدگی سے کام میں مصروف تھا۔کچھ لوگوں نے کانوں پر ہیڈ فون لگا رکھے تھے اور مسلسل ایک لینڈ لائن نمار یموٹ سے کسی کو ہدایت دے رہے، تو کبھی لے رہے تھے۔کمرے کے عین وسط میں ایک بڑی سی گول میز تھی۔گول میز کی سربراہی کرسی پر کوئی وجود بیٹھا تھا، جسکی اُنکی جانب پشت تھی۔

''آپ لوگ بیٹھئے''شیراز نے میز کی جانب اشارہ کیا۔ وہ وجود جو اُنکی جانب پشت کئے بیٹھا تھا، وہ دراصل کسی بڑی سی سکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔وہ لوگ باری باری کرسیوں پر بیٹھے۔اُنکے بیٹھنے کے بعد بھی بہت سی کرسیاں خالی تھی۔شیراز سربراہی کرسی کے پاس جا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔اُسی لمحے سربراہی کرسی اُنکی جانب مڑی اور اُس پے بیٹھا وجود اُنکی نظروں کے سامنے واضح ہوا۔سکرین اب اُسکی پشت پر ہو چکی تھی۔جبکہ وہ لوگ سکرین کو بدستور دیکھ سکتے تھے۔

وہ ایک ادھیڑ عمر مرد تھے۔بال سفید اور سرمئی مائل تھے۔جسمانی لحاظ سے وہ بے حد فٹ انسان لگتے تھے، جیسے کثرت سے ورزش کرتے ہوں۔چہرے پر ایک رُعب سا قائم تھا۔اُنہوں نے سنجیدگی سے ایک نظر سب پر ڈالی۔

''میں ایف آئی اے کاؤنٹر ٹیررارزم ڈیپارٹمنٹ کا ڈی آئی جی ہوں۔ڈی آئی جی فرّخ''اُنہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ اب تک جو کچھ آپ لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے، آپ لوگ یقیناً ان سب صورتحال کو سمجھ نہیں پا رہے ہوں گے۔ میں تمہید نہیں باندھوں گا۔سیدھا سیدھا مدّعے پر آؤں گا۔یہ تصویریں۔۔۔''فرّخ صاحب کہتے ہوئے کرسی سے کھڑے ہوئے اور اپنی پشت پر موجود سکرین کی جانب دیکھا۔سکرین پر اچانک ہی کسی کتاب کے صفحے کی تصویر نمودار ہوئی،اُس صفحے پر کل چھ تصاویر تھیں۔

''یہ تصاویر ہمیں ایک ڈائری سے ملی ہیں۔۔۔''فرّخ صاحب نے کہا۔

''ایک سیریل کلر کی ڈائری سے۔۔۔''اُنہوں سنسنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

"واٹ؟؟" عمر کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔اس سے پہلے کہ فرّخ صاحب کوئی جواب دیتے کمرے کا دروازہ سلائیڈ ہوا۔ دروازے پر کھڑا وجود روشنی سے دور اندھیرے میں نظر آرہا تھا۔ وہ لمبا چوڑا انسان، اس وقت کسی سائے کی مانند لگ رہا تھا، اندھیرے میں بھی وہ دیکھ سکتے تھے کہ اُسکا سر دروازے تک پہنچ رہا ہے۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا کمرے کی مدھم روشنیوں میں اُسکا وجود واضح ہوا۔اور اُسکا چہرہ آج کے دن میں انکو ملنے والا آخری جھٹکا تھا۔

وہ مضبوط مگر آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ٹیبل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چہرے پر شدید سختی چھائی ہونے کے باوجود بھی ایک عجیب سی کشش تھی اُسکے چہرے میں، اُسے بار بار مڑ کر دیکھنے کو دل کرتا تھا۔ جدید تراش خراش کی داڑھی کے ساتھ، اُسکے سیاہ اور سفید بالوں نے اُسکی شخصیت کو مزید گریس فل بنا دیا تھا۔ دائیں آنکھ کے کنارے پر بال جتنا باریک لیکن انگلی جتنا لمبا گہرا سیاہ نشان موجود تھا۔ بھنویں سکیڑے، وہ اُنہی سخت تاثرات کے ساتھ سربراہی کرسی کے عین سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"ایس ایس پی نوید عالم" اُنہوں نے ہاتھ سے نوید کی جانب اشارہ کر کے اُسکا نام بتایا اور بس یہی اُسکا مختصر سا تعارف تھا۔ اُنکی حیران نظریں اس وقت نوید پر تھیں۔ سب سے پہلے کسی نے بڑی مہارت سے اپنے تاثرات چھپائے تھے، تو وہ رضا الٰہی تھا۔ جو ایک ہی نظر اُس پر ڈالنے کے بعد واپس سکرین کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ علی کا چہرہ جو رضا کو سامنے دیکھ کر تنا ہوا تھا، وہ نوید کو سامنے پا کر یکدم ہی حزن و غم کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ اُسکے سامنے تھا لیکن اُس سے دور۔۔۔

نوید کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے ایسے بیٹھ گیا تھا، جیسے وہاں بس وہ یا فرّخ صاحب ہوں۔ باقیوں سے اُسکا کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔

اُسکے بیٹھنے کے بعد فرّخ صاحب نے کیس پر دوبارہ بریفنگ شروع کی تھی۔

نوید بدل گیا تھا۔۔۔بہت بدل گیا تھا۔۔۔

ایک بات جسکی اُنکے دلوں نے تصدیق کی تھی۔

صرف شخصیت ہی نہیں بلکہ ظاہری اعتبار سے بھی وہ بدل گیا تھا۔۔۔

وہ خوبصورت اور پرکشش مرد تھا لیکن، وہاں بیٹھے اپنے تمام دوستوں سے وہ عمر میں بڑا لگ رہا تھا، وجہ اُسکے چند سفید بال نہ تھے بلکہ اُسکے چہرے کی سختی اور شخصیت کا رعب تھا۔

یہ وہ نوید نہیں تھا جسے وہ جانتے تھے۔۔۔

نوید جو سب سے خوش مزاج تھا۔۔۔

جسکی زندگی میں ایک ہزار ایک مسئلے چلتے تھے اور وہ اُنکا برملا اظہار بھی کرتا تھا۔

لیکن پھر بھی ہر دم ہشاش بشاش نظر آتا تھا وہ۔۔۔

یہ وہ نہیں تھا۔۔۔ یہ وہ ہرگز نہیں تھا۔۔۔

سکرین روشن تھی۔ کمرے میں موجود لوگ آہستہ آہستہ کر کے منظر سے غائب ہونے لگے تھے۔ آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں حتیٰ کہ ڈی آئی جی صاحب بھی وہاں نہیں رہے تھے۔ رہ گئے تھے تو خود سے نظریں چُراتے اور اپنے اندر کی آوازوں کو چھپاتے وہ پانچ نفوس۔۔۔ وہ پانچ جن کی زندگیوں میں پچھلے دس سالوں سے چھایا جمود آج ٹوٹنے جا رہا تھا۔

قسمت نے اُنہیں بہت عجیب مقام پر دوبارہ ملایا تھا۔۔۔

---------+---------+---------

''مما یہ دیکھیں، ایکٹیویٹی ڈے میں مجھے بھی کوئز ٹیم کا حصہ بنایا گیا ہے'' وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم خوشی خوشی گھر آ کر اپنی ماں کو بتا رہا تھا۔

''ہاں! ٹھیک ہے'' اُسکی ماں نے کام کرتے ہوئے مصروف سا جواب دیا۔

''اور اتنے سارے بچوں میں صرف مجھے ہی چنا گیا ہے'' وہ پرجوش ہو رہا تھا۔

''نوید! یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے؟'' اُسکی ماں نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت کچن میں کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

"اب ٹیم میں حصہ بنالیا گیا ہے تو جاؤاور جا کر تیاری کرو۔ میرا سر کیوں کھا رہے ہو؟" نوید کا سارا جوش ماند پڑ گیا اور وہ خاموشی سے کمرے میں چلا آیا تھا۔

ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا۔ وہ اسی طرح نظرانداز ہوتا آیا تھا۔ اُسکی خوشی، اُسکی کامیابی کسی کے لیے معنی ہی نہ رکھتی تھی۔ اُسکا چار سال بڑا بھائی، اُسکے ماں باپ کی پہلوٹی کی اولاد، وہ اپنی ماں کا لاڈلا بچہ پہلے ہی یہ سارے کارنامے انجام دے چکا تھا۔ جو جوش اور جذبہ اُسکی ماں کا اپنے بڑے بیٹے کے کسی نئے کارنامے پر ہوتا تھا، وہ نوید تک آتے آتے اسی طرح ماند پڑ جاتا تھا، کیونکہ اُنکے لیے پھر وہ شے یا کارنامہ پرانی بات ہو جاتی تھی۔ اُس میں نیا جیسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ چاہے پہلی بار پرائمری سے سیکنڈری میں جانا ہو یا سیکنڈری سے کالج میں، اپنے لیے نئے مضامین کا چناؤ کرنا ہو یا سپورٹس ڈے میں حصہ لینا ہو، سائیکل چلانا سیکھنا ہو یا کلاس میں پہلی پوزیشن لینا ہو۔ ہر کام اُسکے بھائی کے لیے پہلی دفعہ ہوتا تھا اور نوید کی باری میں وہ کام دوسری دفعہ کے درجے میں آ جاتا تھا لہٰذا پہلی بار جیسا جوش و جذبہ کسی کے پاس نہیں بچتا تھا۔

وہ بھول جاتے تھے کہ بے شک اُن کے لیے یہ نیا نہ ہو، لیکن نوید کے لیے بھی یہ سب نیا تھا اور اُسکی زندگی میں بھی پہلی بار ہی ہو رہا ہوتا تھا۔ اگر وہ سائیکل چلا رہا تھا تو وہ اُسکے لیے پہلی بار ہی تھا۔ لیکن اُسکی دفعہ میں ماں باپ کی جانب سے کوئی حوصلہ افزائی نہ ملتی۔

اُسکا باپ، گھر میں جب بھی داخل ہوتا تو برے موڈ کے ساتھ، وہ پورے ہفتے کسی کی بات سننے کا روادار بھی نہ ہوتا تھا اور نہ ہی گھر آتے ساتھ اُسے بچوں کی شکلیں اور آوازیں پسند تھیں۔ البتہ نوید سے آٹھ سالہ چھوٹی بہن اس اصول سے مستثنیٰ تھی۔ وہ اپنے باپ کی لاڈلی تھی۔

اور نوید۔۔۔ وہ ان سب میں کہاں تھا؟ کہیں نہیں۔۔۔ وہ مڈل چائلڈ تھا اور یہی اُسکی قسمت تھی۔ اُسے نہ گھر کے بڑے بچے جتنی اہمیت حاصل تھی نہ گھر کے چھوٹے بچے جتنا لاڈ اُسکا نصیب تھا۔

وہ جب اپنے باپ کے پاس کچھ سیکھنے جاتا، چاہے ریاضی کے سوالات ہوں یا ریموٹ کنٹرول گاڑی چلانا سیکھنا ہو یا کمپیوٹر چلانا، اُسکے باپ کے پاس ایک ہی جواب ہوتا کہ "اپنے بڑے بھائی سے سیکھ لو میں اُسے سکھا چکا ہوں" وہ اُنکا وقت چاہتا تھا اور اُنکے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ وہ یہ وقت، اپنے بڑے بیٹے کو، یہ سب چیزیں سکھانے میں پہلے ہی صرف کر چکے تھے۔ اب بھلا اُسکے لیے دوبارہ وقت کیوں ضائع کرتے؟

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کاش اُسکا کوئی نانا، دادا یا دادی ہوتی جن کا وہ لاڈلا ہوتا کیونکہ کہانیوں میں تو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے ناں، جو کسی کا پسندیدہ نہیں ہوتا اُسکو کوئی ایک تو پسند کرتا ہے، لیکن ایسا بس کہانیوں میں ہوتا ہے۔

اُسکا بھائی اسے پڑھاتا اور ذرا سی غلطی پر اُسے تھپڑ جڑ دیتا، وہ اپنی ماں سے شکایت کرتا تو جواب آتا کہ

''بڑا بھائی ہے مار بھی دیا تو کیا ہوا؟ تمہارے بھلے کے لیے ہی مارا ہو گا''

اُسکا کوئی بھی نیا کھلونا، کلر پنسل کا باکس حتیٰ کہ اسکو ملنے والا گفٹ بھی اُسکا بھائی کھولتا۔ اُسکے کھلونے سے پہلے اُسکا بھائی کھیل کر دیکھتا پھر اُسکے حوالے کرتا، اور اُسکے احتجاج کرنے پر ہمیشہ کی طرح ایک ہی جواب ملتا۔

''تم چھوٹے ہو ابھی، تمہیں معلوم نہیں چیزوں کو کیسے استعمال کرنا ہے، وہ بڑا ہے جیسے بتا رہا ہے ویسے کرو۔''

حتیٰ کہ اُسکی ماں نے چاکلیٹ لا کر رکھی تو وہ بھی اُسکا بھائی اسے نکال کر دیتا تھا کہ مجھے زیادہ معلوم ہے کہ تمہیں کب دینی ہے؟ اُسکے دوست کون ہونگے، کون نہیں یہ فیصلہ بھی اُسکا بھائی کرتا۔ وہ جسے خراب کہہ دیتا، اُسکی ماں اُسے، اُس سے ملنے سے منع کر دیتی۔ وہ جسکو اچھا کہتا، اُسکی ماں اُسی سے دوستی کرنے کو کہتی بھلے وہ نوید کو کتنا ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔

ایک روز اُسکے بھائی نے اُسے کچھ کام کرنے کو کہا تھا۔ جسے کرنے سے نوید نے منع کر دیا۔ جواباً اُس نے اُسے دھمکی دی کہ اب تم دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ اور شام میں جب نوید معمول کے مطابق کھیلنے جا رہا تھا۔ اُسی لمحے اُسکے بھائی نے ماں سے کہہ دیا کہ ''اسے باہر مت بھیجیں، اِسکے یہ دوست بہت برے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے، یہ گندی باتیں کرتے ہیں'' نوید بھونچکارہ گیا، وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ اور وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ اُسکے بھائی کی بات سچ تھی اور اُسکی جھوٹی، وہ جتنا چیختا چلاتا، اُسکی بات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جو اُسکے بھائی نے کہہ دیا وہی سچ ہوتا تھا۔ اُس روز اُس نے گھر کی کھڑکی سے اپنے دوستوں کو کھیلتے دیکھا تھا اور پورا دن کڑھتا رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کو کیسے بتاتا کہ یہ اُسکے بھائی نے سازش کی ہے؟ اُسکی بات کا بھلا کون یقین کرتا؟ ایک بار بتانے کی کوشش کی تو جواب آیا۔

''تم یہ کہانیاں پڑھنا چھوڑ دو، اپنے آپ کو اُسی کا مظلوم کردار سمجھنے لگے ہو۔ باہر آ جاؤ خیالوں کی دنیا سے'' نوید کو کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا وہ ماہانہ رسالے اور کتابیں خریدتا تھا۔ اسی لیے اِسکو یہ طعنہ ملتا۔

ماں باپ بڑے بچوں کو اختیار دے کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بچے ہی ہیں، وہ اپنے اختیارات کا استعمال بچوں کی طرح ہی کرینگے، اپنا مفاد بھی دیکھیں گے اور جھوٹ بھی بولیں گے۔ وہ اتنے ذمّے دار ہوتے نہیں ہے، جتنا ماں باپ اُنہیں سمجھ لیتے ہیں۔ ان سب چیزوں کی وجہ سے دن بدن اُسکی قوت فیصلہ اور خود اعتمادی ختم ہوتی چلی گئی۔

اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی یہی، ایک آدھ تھپڑ اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو مارے تو، اُس روز وہ اپنے باپ سے بری طرح پیٹا تھا۔ اُس دن کے بعد اُس نے دوبارہ اپنی بہن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اُسکو لگتا تھا کہ ہر چھوٹا ایسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ خود ہے، لیکن ایسا نہیں تھا، اُسکی بہن اکلوتی اور باپ کی لاڈلی ہونے کے باعث ویسی نہیں تھی، جیسے وہ خود تھا۔

وہ سب سے زیادہ اپنی بہن کی ناانصافیوں کا شکار ہوا تھا۔ وہ بے شک چھوٹی بچی تھی، لیکن گھر میں جو دیکھتی رہی وہی سیکھتی تھی۔ وہ وائلنٹ (تشدد پسند) تھی، مار پیٹ بہت کرتی تھی۔ کبھی کوئی چیز اُٹھا کر دے ماری تو کبھی کچھ۔۔ شکایت کرنے پر نوید کو ایک ہی جواب ملتا۔

''تم نے ہی کچھ کیا ہوگا''

''تمہاری ہی غلطی ہوگی۔''

''وہ چھوٹی ہے برداشت نہیں کر سکتے؟ ہر وقت چھوٹی بہن سے مقابلہ بازی'' اور وہ چپ ہو جاتا۔

اُسکے گھر کے بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ اُسکے ماں باپ تھے۔ باپ بے دھڑک ہاتھ اٹھاتا تھا اور ماں ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ بدزبان بھی تھیں۔ گالیاں اور طعنے اُنکی زبان پر رہتے تھے۔ غصّہ اترتا تو بڑے پیار سے بلا کر کہتی کہ

''ماں ہوں، ماں باپ تو گالیاں دیتے ہیں۔ اِس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات ہے؟ ماں باپ کی گالیاں کھاؤ گے، تو زمانے کی گالیوں سے بچو گے''

اُسکی بہن کی سب سے بری عادت جھوٹی شکایت کرنا تھی، وہ جھوٹ بھی کہتی تو اُسکا باپ سچ مان لیتا اور نوید حلف بھی اٹھاتا تو وہ ''جھوٹا'' ہی قرار پاتا۔ بھائی کے کام کے لیے اُسے دوڑایا جاتا کہ بڑا بھائی ہے پانی مانگ رہا ہے لا کر دو، بڑا بھائی ہے کہہ رہا ہے کہ اُسکی الماری ٹھیک کر دو تو کر دو نا۔۔۔

لیکن یہی کام جب وہ اپنی چھوٹی بہن سے کہتا تو مکالمے تبدیل ہو جاتے۔

''اپنے کام خود کرو، نوکر ہے بہن تمہاری؟''

''چھوٹی ہے وہ، کیوں اُسکو کام بول رہے ہو، اُٹھ کر خود کرو''

ان سب چیزوں نے اُسکی شخصیت کو باری باری خراب کرنا شروع کیا۔اُس میں متواتر تبدیلیاں آنا شروع ہوئی تھیں۔

پہلی تبدیل یہ تھی کہ اُس نے اپنے اِرد گرد خیالی کردار بنا لیے،اُسکا ایک خیالی گھر تھا، جس میں اُسکا باپ ہمیشہ اس سے پیار سے بات کرتا تھا، اُسکی بات کو بھی اتنی اہمیت اور توجہ دیتا تھا، جتنی اُسکی بہن کو۔ وہاں اُسکی ایک ماں تھی، جو اس کو خود سے پڑھاتی اور اُسکو فیصلے کا اختیار دیتی تھی۔ چیزیں خراب ہونے پر پیار سے سمجھاتی تھی۔ اپنی ساس نندوں اور شوہر کا غصّہ اُس پر نہیں اتارتی تھی۔

وہاں اُسکا ایک بھائی تھا، جو اُسکا بیسٹ فرینڈ تھا اور اُسکی ایک شرارتی سی بہن جو اُسکی کرائم پارٹنر تھی۔

اپنے اِس خیالی گھر کے ساتھ وہ خوش تھا۔ وہ روزانہ کئی کئی قسم کے خیالی منظر نامے بناتا اور اپنے اس خیالی خاندان کے کرداروں کے ساتھ اُن منظر کو جیتا تھا۔ وہاں سب کچھ اچھا تھا، ہر شے اُسکی مرضی کے مطابق تھی، سب خوش رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ان منظر ناموں میں اتنا گم ہو جاتا کہ اُسے آس پاس کا ہوش ہی نہ رہتا۔ ایسے میں کوئی اُسکے سر پر کھڑا کچھ کہہ بھی رہا ہوتا، تب بھی اُسے آواز نہ آتی۔ یہ تھی دوسری تبدیلی جو اُسکی ذات میں آئی تھی۔ وہ ان خیالی دنیا میں اس حد تک گم رہنے لگا تھا کہ وہ باتیں بھولنے لگتا، جو کام کہا جاتا وہ اُس سے عموماً غلط ہو جاتا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلتا کہ اُسکو پُکارا جا رہا ہے یا کچھ کہا جا رہا ہے؟ اُسکے باپ نے اُسے بلب ٹھیک کرنے کو کہا تھا اور اپنی اسی خیالی دنیا میں مگن وہ بھول گیا۔ اُسے اپنے باپ سے ٹھیک ٹھاک مار پڑی۔ اُسکی ماں نے اُسے سامان لانے کو کہا تھا اور وہ ان میں سے کوئی شے بھول گیا اور اُسکی ماں نے ہاتھ میں پکڑا بیلن اٹھا کر اُسکے کندھوں پر دے مارا۔ اور یوں یہ معمول کی بات بن گئی۔ اُس سے جو بھی کام ہوتا وہ غلط ہی ہو جاتا۔ اُس نے خود پر قابو کرنے کی کوشش بھی کی لیکن جیسے اُسکی قسمت ہی خراب تھی۔ اب اُسکی خود اعتمادی، خوف میں تبدل ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے ڈر رہتا کہ وہ جو بھی کام کریگا، اُس سے غلط ہی ہو گا۔ اپنے ماں باپ اور خصوصاً باپ سے بات کرتے ہوئے اُسکے ہاتھ کانپنے لگتے تھے، زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔

اُسکا باپ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا، اور اُسے پانی لانے کو کہا، اُسکے کانپتے ہاتھوں سے پانی چھلک کر اُسکے باپ کے پرنٹ ہوئے کاغذات پر گر گیا۔ اُسکے باپ نے اُس روز اُسے پاس پڑی، اُسکے دادا مرحوم کی یادگار لاٹھی سے بری طرح پیٹا تھا۔ پرنٹ ہوئے پیپرز ہی تھے نا، دوبارہ بھی پرنٹ ہو سکتے تھے؟ لیکن وہ نوید سے زیادہ اہم تھے یقیناً۔

اُس نے ایک روز کرکٹ کھیلتے ہوئے کمرے کا شیشہ توڑ دیا۔اس غلطی کا اعتراف اُس نے خود اپنے باپ سے کیا۔ٹوٹا شیشہ دیکھنے پر اُسکے باپ نے وہی کیا جو ہمیشہ کرتا تھا۔یعنی اسکو پیٹنا۔ وہ اپنے بڑے بھائی اور اپنی آٹھ سالہ چھوٹی بہن کے سامنے آئے روز مار کھاتا تھا۔اُس روز نوید نے ایک بات سیکھ لی۔ غلطی کرنی ہے، لیکن بتانا نہیں ہے۔اُسکے ماں باپ ہمیشہ کہتے سچ بولو، سچ بولنے سے نقصان کم ہوتا ہے اور وغیرہ وغیرہ لیکن سچ بولنے کی جو سزا اُسے ایک بار مل چکی تھی،اُس سے بہتر اُس نے جھوٹ بولنا سمجھا۔نوید زندگی میں جو کام کرتا وہ صرف مار سے بچنے کے لیے کرتا۔

وہ غلطیاں کر کے چھپا دیتا،استری کرتے ہوئے شرٹ جل گئی، یا گلاس ٹوٹ گیا یا کپڑوں پر تیل گر گیا، یہ سب باتیں وہ جتنا ہو سکتا، اتنا چھپاتا اور جب ان میں سے کوئی ایک آدھ بات پتہ چل جاتی تو وہی ہوتا جسکا اُسے ڈر تھا۔

ایک عمر میں آکر اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک dysfunctional خاندان کا حصہ ہے،اُسکے ماں باپ کی آپس میں بھی کبھی نہیں بنی تھی۔ایسا لگتا تھا اُنہوں نے اپنا ایک ایک پسندیدہ بچہ بنا لیا تھا،اور وہ اس بچے کو اپنا ہمنوا اور اپنے زوج کا حریف بنا رہے تھے۔اُسکا باپ اُسکے بھائی کو ڈانٹتا تو ماں بیچ میں آجاتی تھی،اور ماں بہن کو کچھ کہتی تو باپ لڑ پڑتا تھا، لیکن نوید کے لیے نہ ماں آتی تھی نہ باپ۔

اُس نے توجہ لینے کے لئے نت نئے کام کرنے شروع کر دیئے تھے۔وہ ذرا ذرا سی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بتاتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھنٹوں بیٹھ کر روتا۔یہ شخصیت کی تیسری تبدیلی تھی، جو اس میں آئی تھی۔اُس کی ان حرکتوں کی وجہ سے اُسکے گھر والے اس سے عاجز آگئے، اُنہوں نے اُسکی کسی بھی تکلیف پر توجہ دینی ہی چھوڑ دی۔نوید بھی ایسا کب تک کرتا آخر؟ کچھ عرصے میں وہ بڑا ہونے لگا تو اس نے بھی یہ عادت چھوڑ دی۔البتہ ایک عادت جو اُسکے گھر والوں نے نہ چھوڑی، وہ تھی اُسکی غلطیوں کو بار بار یاد کروانے کی۔اب اُسے حقیقتاً کوئی تکلیف پہنچتی، تو وہ اُسے کہتے کہ ''ڈرامے باز! اسے تو عادت ہے اوور ایکٹ کرنے کی، چھوڑ دو اِسے، توجہ لینے کے لیے ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔خود ہی ٹھیک ہو جائے گا جب توجہ نہیں ملے گی۔ یہ تو ہے ہی اٹینشن سیکر''اور جھوٹے کے بعد یہ دوسرا خطاب تھا جو اُسے ملا تھا ''اٹینشن سیکر''۔ حد تو یہ تھی کہ اگر وہ اپنی چھوٹی بہن کو کسی غلط بات سے روکتا، تو وہ اپنے ہم عمر دوستوں اور کزن کے سامنے بے بانگ دہل کہتی۔

''نظر انداز کرو اِسکو، یہ ایسے ہی فضول میں بولتا رہتا ہے، اٹنشن سیکر''

ان سب باتوں کے بعد نوید نے اپنے گھر والوں سے خود کو دور کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے گھر سے باہر دوستیاں کرنا اور دوسروں سے توجہ حاصل کرنی شروع کر دی۔ کوئی اُسے ذرا سی اہمیت دیتا، وہ اُسکا اچھا دوست ہو جاتا اور نوید پھر اُسکے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا۔ یہ اُسکی شخصیت میں آنے والی چوتھی تبدیلی تھی۔ کالج کے زمانے میں اس نے ڈھیروں دوست جمع کر لئے تھے۔ اور اُن دوستوں نے بھی خوب اُس سے فائدہ اٹھایا۔

اِس صورتحال سے باہر بھی اُسے، اُسکی توجہ لینے والی عادت نے ہی نکلوایا تھا، ورنہ کسی روز وہ بڑا نقصان اٹھا سکتا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک بار اُس نے اپنے سارے دوستوں سے ایک ہفتے تک بات نہ کی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی تو اُسکا بہترین دوست ہو گا، جسے اُسکی فکر ہو گی۔ ایک ہفتے سے دو ہفتے اور مہینوں ہو گئے، لیکن کسی کو نوید کے غائب ہونے سے فرق نہیں پڑا۔ اُس دن کے بعد سے اُس نے دوستیاں کرنا بھی چھوڑ دیں۔ اُس نے خود کو اکیلا کر لیا۔ یہ شخصیت کی پانچویں تیز ترین تبدیلی تھی، جو اس میں آئی تھی۔ اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ دوستیاں کرنا چاہتا ہے یا دنیا سے کٹ کر رہنا چاہتا ہے؟

وہ بڑا ہو گیا تو اُسکے بہن بھائی بھی بڑے ہو گئے۔ اُس کا بچپن ختم ہوا تو اُن دونوں کا بھی ختم ہو گیا لیکن اب نوید کی شخصیت تباہ ہو چکی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اپنے بہن بھائیوں سے کوئی تعلق قائم نہیں کر پاتا تھا۔ اب اُسکا بھائی اُس سے بات کرنا چاہتا تو وہ اُٹھ کر چلا جاتا۔ اُسکا بھائی خوشی خوشی اُسے اپنی کوئی کامیابی دکھانے یا کوئی بات بتانے آتا تو وہ بے تاثر سے چہرے کے ساتھ اُس سے کہتا "تو میں کیا کروں؟" وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ اُسکی بہن اب اُسکے ساتھ ہنسی مذاق کرنا چاہتی تو وہ اُسے جھڑک دیتا۔ وہ اُس سے ڈر کے مارے کوئی فرمائش کرتی نہ کبھی عیدی مانگنے آتی، جیسے اپنے بڑے بھائی سے کرتی تھی۔ وہ بڑی ہو چکی تھی جھوٹی شکایتیں تو دور اب وہ نوید کی سچی شکایت بھی نہ کرتی تھی۔ بچپن میں جس بھائی کو ڈانٹ پڑتا دیکھ کر وہ خوش ہوتی تھی، اب اس بھائی کو پٹتا دیکھ کر اُسے رونا آتا تھا، باپ کو چیختا چلاتا دیکھ کر اُسے ڈر لگتا تھا اور گھر کے ماحول کو خرابی سے بچانے کے لیے اس نے نوید سے بات ہی کرنی چھوڑ دی تھی۔

ایک دفعہ نوید نے اپنے باپ سے بائیک مانگی، اُنہوں نے پہلی فرصت میں اُسے منع کر دیا کہ "تم مار دو گے کہیں پر"، ہمیشہ جو بات اُس نے نہیں کی ہوتی تھی، وہ پہلے سے ہی اُسکی ذات سے منسوب کر دی جاتی۔ پھر اُس نے بھی وہی کیا جو اُس نے سیکھ لیا تھا۔ اور وہ تھا چھپ کر اپنی خواہش پوری کرنا۔ اُس نے بنا اجازت اپنے باپ کی غیر موجودگی میں بائیک چلائی۔ ایک بار، دو بار، تین بار اور وہ ہر روز یہی کرنے لگا۔ ایک روز اُسکی چلتی بائیک پھسل کر گر گئی اور ہینڈل ٹیڑھا ہو گیا۔ باپ کی مار کی ڈر سے اُس نے کچھ جمع پیسوں اور کچھ دوستوں سے ادھار لیکر

بائیک بنوا دی اور گھر لا کر کھڑی کر دی۔ دو دن سکون سے گزرے، کسی کو کچھ معلوم نہ ہوا لیکن تیسرے دن میکینک نے اُسکے باپ سے پوچھ لیا کہ ''بائیک کا ہینڈل ٹھیک ہے ناں اب؟'' اُسکے باپ نے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔

''ہینڈل کو بھلا کیا ہونا تھا؟''

''لگتا ہے آپکے بیٹے نے بتایا نہیں'' اُس نے ہنستے ہوئے اُنہیں نوید کی کارستانی بتائی۔ وہ تن فن کرتے گھر آئے اور ہمیشہ کی طرح اُسے ڈنڈوں، لاتوں اور تھپڑوں سے مارا۔ اگلے دن اکیس سالہ نوید اپنے بہن بھائیوں کے سامنے پٹنے کے بعد صبح اٹھا بھی اور یونیورسٹی بھی گیا، وہاں سب کے سامنے ہشاش بشاش نظر بھی آیا، اور سب سے اخلاق سے ملا بھی اور اسی طرح واپس گھر بھی آ گیا۔ یہ شخصیت کی چھٹی تبدیلی تھی۔

اگلے روز اُسکی پھوپھو اپنے بچوں کے ساتھ ملنے آئیں اور اُنکے سامنے اُسکے ابا نے کسی بات کے جواب میں نوید کی پچھلی رات کی پٹائی کا ذکر نکال دیا۔

''ارے آپا! مار بھی دیا تو کیا ہو گیا؟ یہ بیٹھا ہے نوید، اس سے پوچھیں۔۔۔'' ہاتھ سے نوید کی طرف اشارہ کیا ''یہ تو مجھ سے ابھی بھی مار کھاتا ہے، کل رات ہی اسے بری طرح پیٹا ہے میں نے۔ بائیک مار دی اور مجھے بتایا ہی نہیں۔ سمجھ رہا تھا کہ باپ بیوقوف ہے'' اُسکا باپ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ وہ شدید صدمے کی کیفیت میں اُنہیں دیکھتا چلا گیا۔ اُسکی عزت نفس تو ویسے ہی مار دی گئی تھی، آج گھر کے باہر بھی اُسکی عزت دو کوڑی کی کر دی تھی اُسکے باپ نے۔ اُسکے پھوپھو زاد کھی کھی کر کے ہنس رہے تھے۔ اُسکے بعد تو جیسے یہ معمول بن گیا، اُسکے گھر والوں کے لیے سب سے تفریح موضوع ہوتا تھا کہ ''نوید کو فلاں دن فلاں بات پر مار پڑی'' یا ''نوید نے فلاں کام کر کے چھپا کر رکھ دیا اور سمجھا ہمیں پتہ نہیں چلے گا'' اور بہت سے ایسے موضوع جو اُسکی عزت نفس مجروح کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ جب نوید کا چہرہ یہ سب سن کر بگڑنے لگتا، تو اُسکی ماں کہتی کہ ''اب زیادہ غصّہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مذاق ہی کر رہے ہیں ہم، برا تھوڑی کہہ رہے تمہیں''

اُس دن کے بعد اُس نے رشتے داروں کے سامنے بھی آنا چھوڑ دیا۔ شخصیت کی آخری تبدیلی جو اُس میں آئی تھی وہ تھی بدزبانی۔۔۔

وہ کوئی ماروائی مخلوق نہیں تھا، جو ہر چیز سہہ کر بھی بہترین اور مکمل انسان بن جاتا۔ نہ ہی وہ اتنا صابر تھا۔ وہ انسان تھا، ایک بے حد عام انسان۔

اُس پر بھی رویوں کا وہی اثر ہوا تھا، جو کسی بھی عام انسان پر ہو سکتا ہے۔ وہ زبان درازی کرنے لگا تھا، بات بات پر بحث کرنے لگا تھا۔ گھڑی دو گھڑی پر اپنی بہن کو جھڑکنے لگا تھا۔ اُسکا بھائی اسے جو کام کرنے سے منع کرتا، وہ وہی کام کرنے لگا تھا۔

آپ کسی کو کہہ کر دیکھ لیں کہ تمہارا باپ رشوت لیتا ہے، وہ کبھی اپنے باپ کو برا نہیں کہے گا۔ اُسکے پاس ہزاروں جواز ہونگے کہ "اوپر والے مجبور کرتے ہیں"، "یہ نوکری ہی ایسی ہے، رشوت نہیں لینگے تو اوپر والے نکال دینگے" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ کبھی نہیں مانے گا کہ اُسکا باپ برا ہے۔ اولاد کبھی بھی ماں باپ کو برا نہیں سمجھتی، وہ ہمیشہ ماں باپ کی غلطیوں کا جواز تلاش کرتی ہے۔ پھر یا تو اس جواز سے نفرت کرنے لگتی ہے یا اس جواز کو ختم کرنے کے طریقے سوچنے لگتی ہے۔ اور اگر یہ جواز اُسکے اپنے بہن بھائی ہوں تو یا تو وہ اُسکی نفرت کا شکار ہوتے ہیں، یا پھر اولاد اپنے اُس بہن بھائی کو ماں باپ کی نظروں سے گم کرنے یا اُسے اُنکی نظروں میں گرانے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ یہیں سے شروع ہوتی ہے اُنکے درمیان حسد اور اور جلن کی داستان، جس میں سراسر قصور والدین کی ناانصافی اور غیر مساوی سلوک کا ہوتا ہے۔ ورنہ اپنے خون سے نفرت کرنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہے۔ نوید اور اُسکے بہن بھائیوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، ماں باپ کے غلط رویوں نے بہن بھائیوں میں دراڑ ڈال دی تھی۔

گھر والے تو گھر والے، خاندان والے بھی نوید سے دور رہنے لگے تھے۔ اُسے اکھڑ، بدتمیز اور کھڑوس جیسے الفاظ سے یاد کرنے لگے تھے۔ لیکن اُسے فرق نہیں پڑتا تھا، کم از کم وہ اُسکے سامنے تو ایسا کہنے کی جرت نہیں کرتے تھے۔ اُسکے بہن بھائی جو آپس میں ہنسی مذاق کر رہے ہوتے، وہ اُسے دیکھ کر ایک دم سے چپ ہو جاتے۔ نوید کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اُسکا باپ اُسے اب بھی مارتا تھا۔ اب بھی۔۔۔ جب کہ وہ ایک یونیورسٹی کا نوجوان طالب علم تھا، لیکن اب وہ اپنے باپ سے بحث برائے بحث کرنے لگا تھا، چیخنے لگا تھا، چلانے لگا تھا۔ جب مار ہی کھانی تھی تو دل کی بھڑاس نکال کر کھانی تھی۔ لیکن دل کی بھڑاس تو پھر بھی نہ نکلتی تھی۔ اُسے فیصلے کا اختیار نہیں دیا گیا تو اب وہ فیصلے کر کے صرف اُنہیں اطلاع دینے لگا تھا۔ شروع شروع میں وہ اُسے بہت لعن طعن کرتے، مارتے پیٹتے اور گالیاں دیتے، لیکن جب وہ ڈھیٹ کا ڈھیٹ بنا رہا تو انہوں نے بھی تھک کر اُسے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ البتہ اب جب وہ آکر اطلاع دیا کرتا کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے تو وہ آگے سے کہتے "ہم کیا کریں پھر؟ کرو جا کر جو کرنا ہے۔ لیکن بعد میں رونے کے لیے ہمارے پاس نہیں آنا" جیسے وہ جو بھی کام کریگا اُسے نقصان ہی ہو گا۔

چوبیس سال کی عمر میں جو آخری خطاب اُسے اپنے ماں باپ کی طرف سے ملا تھا وہ تھا ''نافرمان''

نوید اپنے ماں باپ کی نافرمان اولاد بن گیا تھا۔

---------+---------+---------

بارہ سال پہلے:

''میں یہاں ڈیپارٹمنٹ کے سامنے چلتی ہوئی آؤنگی اور تم لوگوں کو روک کر سوال کرونگی۔ تم لوگوں نے ایسے دکھانا ہے، جیسے تم لوگ اپنے کام سے جارہے تھے اور میں نے راستے میں روک لیا'' حور اپنے سامنے کھڑے حسین، مقدّم و ایمان کو سمجھا رہی تھی۔ ایمان کو تو سمجھ آرہی تھی لیکن مقدّم اور حسین کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہے تھے۔

''اور رضا بھائی! آپ یہ کیمرا ٹھیک سے سنبھال تو لیں گے نا؟'' اب کہ وہ ہاتھوں میں کیمرا تھامے رضا کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میں اپنا کام ٹھیک طرح سے ہی کرتا ہوں۔ تم بس ان لوگوں کو سنبھالو'' اُس نے ہاتھ کے اشارے سے حسین اور مقدّم کی جانب اشارہ کیا، جنکی آنکھوں میں شرارت واضع نظر آرہی تھی۔

''بھئی! ہم سمجھ گئے ہیں، مزید کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مقدّم نے شرافت سے کہا۔

''جلدی رپورٹنگ شروع کرو پھر کلاس لینے بھی جانا ہے۔ فارغ تھوڑی ہیں'' حسین نے بے مروتی کی انتہا کردی۔ حورعین نے اُسے کسی خاطر میں نہ لایا تھا۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! میں جاتی ہوں، رضا تم نے یونیورسٹی کا آرک پورا کور کرنا ہے۔ پہلے ایمان تم نے گیٹ سے چلتے ہوئے آنا ہے۔ میں تمہیں روک کر تم سے سوال کرونگی'' اُس نے رضا اور ایمان کو بیک وقت ہدایت دی تھی۔ رضا کیمرہ لے کر پیچھے ہوا اور حورعین کو انگھوٹے سے اوکے کا اشارہ کیا۔

''میں تو بہت تھک گیا ہوں یار!'' مقدّم کے کندھے پر بازو ٹکائے کھڑے حسین نے کہا۔

''کیا زمانہ آگیا ہے، لوگ کچھ نہ کر کے بھی تھکن کا شکار ہو جاتے ہیں'' حور نے اُس پر چوٹ کی۔

''ہمارے پاس بس آدھا گھنٹہ ہے۔'' رضا نے یاد کروایا۔ صبح کے نو بج رہے تھے، دھوپ ہلکی مگر خوبصورت لگ رہی تھی، ایسے میں یہ ساری تگ ودو حور عین کے جرنلزم کے پروجیکٹ کے لیے ہو رہی تھی۔ اُسے ''پُرامن جامعہ کے پُرامن طلبہ'' پر ایک رپورٹ تیار کرنی تھی۔ اسی لیے آج وہ اُن سب کو یہاں لائی تھی۔ اُن میں سے کوئی بھی اتنا اچھا نہ تھا، کہ فی سبیل اللہ اُسکا ساتھ دینے کے لیے دھوپ میں خوار ہوتا۔ ویسے بھی جامعہ کے آرک تک جانا، اور رپورٹنگ پوری کر کے واپس ڈیپارٹمنٹ آنا، ایک ہوش مند انسان کا کام تو نہ تھا۔ ہاں! اگر اس کام کے بدلے معاوضے کی صورت میں اُن بھوکوں کی فوج کو کچھ کھانے پینے کو مل جاتا تو الگ بات تھی۔ رپورٹنگ کے بعد حور عین کا اُنہیں لنچ کروانے کا ارادہ تھا۔

''اسلام علیکم ناظرین! میں ہوں حور عین مصطفیٰ اور آج کی رپورٹ میں، میں آپکو دکھاؤں گی کہ جامعہ۔۔۔''

''ہاہاہاہا۔۔۔ ہاہاہاہا'' حور عین کا تعارف مکمل ہونے سے پہلے ہی مقدم اور حسین ہنس ہنس کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ ایمان اپنی مسکراہٹ ضبط کر رہی تھی جبکہ رضا اور حور سنجیدہ مگر گھورتی نظروں سے اُن دونوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔

''ہو گیا تم دونوں کا؟'' حور نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم اتنی مضحکہ خیز لگ رہی ہو'' حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اُسکی اس بات پر مقدّم ہنستے ہنستے رکوع میں چلا گیا۔ پہلی بار رضا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی تھی۔

''دفعہ کروان دونوں کو، تم دوبارہ شروع کر کے ایمان سے انٹرویو لو۔ میں ریکارڈنگ کر رہا ہوں'' رضا نے کہا تو حور عین نے دوبارہ شروع کیا۔ اپنا تعارف دینے کے بعد اُس نے کیمرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا کہ

''آج ہم جامعہ کے طالب علموں سے پوچھیں گے کہ اس جامعہ کی پرامن زندگی کے حوالے سے اُنکے کیا تاثرات ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آرک کے سامنے سے ہٹتے ہوئے چھوٹے گیٹ کے سامنے آئی، جہاں سے کتابوں میں سر کھپائے ایمان باہر آرہی تھی۔

''السلام علیکم!'' اُس نے ایمان کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ رضا مہارت سے دونوں کو کور کر رہا تھا۔

''کیا نام ہے آپکا؟''

''میں ایمان سلیم''

''جی! تو ایمان یہ بتائیے کہ کون سے ڈیپارٹمنٹ سے ہیں آپ؟''

''میں وی ایس۔۔۔''

''آپ اس جامعہ کی پر امن زندگی کے حوالے سے کیا کہنا چاہیں گی؟''

''جامعہ کراچی ایک بہت ہی پر امن اور پر سکون ماحول فراہم کرتی ہے۔ یہاں کے طلبہ و طالبات بہت ہی سمجھدار اور سلجھے ہوئے مزاج کے ہوتے ہیں'' ایمان بتا رہی تھی۔ اُن دونوں کا رخ کیمرے کی جانب تھا۔ اتنے میں دو انسان، اُن دونوں کے پیچھے آکر کھڑے ہوئے۔ ایک نے دوسرے کے سر پر تھپڑ لگایا، تو دوسرے نے پلٹ کر اُسکے منہ پر۔۔۔ پھر اُس نے اُسکو مکا مارا تو دوسرے نے اُسکی کمر پر گھوم کر لات ماری۔

''یہاں کہ طلبہ کبھی بھی لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ جیسی سر گرمیوں میں ملوث نظر نہیں آتے'' ایمان بتا رہی تھی۔ پیچھے کھڑے آپس میں گھتم گھتا حسین اور مقدم ایک دوسرے کا گریبان پکڑے ہوئے تھے۔ مقدّم نے حسین کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اُسکے منہ پر چپیڑیں مارنے لگا۔

''تو کیا پڑھائی کہ علاوہ بھی سر گرمیاں ہوتی ہیں یہاں؟'' حور عین نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں! یہاں پر مختلف قسم کے کھیل اور ایونٹس وغیرہ ہوتے ہیں، طلباء و طالبات اس میں حصہ۔۔۔'' پیچھے چلتی ریسلنگ نے اچانک ہی پلٹا کھایا اور اب حسین نے مقدّم کو زمین بوس کر کے اُسکی ایک ٹانگ کو گھٹنوں سے پکڑ کر زور سے کہا۔

''ایک۔۔دو۔۔۔ تین۔۔۔۔ پن۔۔۔۔'' اُس نے مقدّم کی ٹانگ چھوڑی اور اُٹھ کر دونوں ہاتھ بلند کیے ''میں جیت گیا، میں جیت گیا''

''کیا بکواس ہے یہ؟'' حور عین نے جھٹکے سے پلٹ کر اُن دونوں کو دیکھا۔ حسین ہاتھ دے کر مقدّم کو اٹھا رہا تھا۔ دونوں کے لباس مٹی مٹی ہو چکے تھے۔ دوسرے دروازے پر بیٹھے گارڈ بھی ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

''کیا کر رہے تھے تم دونوں؟''اُس نے لڑاکا انداز میں کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ریسلنگ۔۔۔''اُن دونوں نے دانت نکالے۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''اب کہ وہ ان دونوں کو اُنکے حال پر چھوڑ کر رضا کی طرف مڑی۔

''مجھے لگا کہ تم ان دونوں کو ایڈٹ کر کے ہٹا دو گی''رضا نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''اتنی باصلاحیت ہوتی میں تو تم سب کے ساتھ وقت برباد کرتیں؟''وہ ٹھیک ٹھاک تپ گئی۔

''تو کس نے کہا ہے کہ ہمارے ساتھ وقت برباد کرو؟ جاؤ اور جا کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ پکڑو''حسین نے جواب دیا۔

''ٹیچر نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سٹوڈنٹس منع کیے ہیں۔ ورنہ میری جوتی بھی تمہارا احسان نہ لے''وہ پاؤں پٹختی ہوئی پاس رکھی بینچ پر جا بیٹھی۔

''انسانوں والے کام نہیں کر سکتے؟''رضا نے آگے بڑھ کر حسین کے سر پر چپت لگائی تھی۔

''یار! اب مناؤ اسکو، میں لنچ کے آسرے پر ناشتہ بھی کر کے نہیں آیا تھا''مقدّم نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''میں اکیلا مناؤں؟ تم ساتھ شامل نہیں تھے کیا؟''حسین نے گھورا۔

''تم مناؤ، میں تمہارا ساتھ دے دونگا۔ میں بھوکا گھر نہیں جانا چاہتا''مقدّم نے کہا تو وہ بدستور اُسے گھورتے ہوئے، منہ بنائے بیٹھی حور عین کے پاس آیا۔

''اچھا اب ناراض نہ ہو، دوبارہ نہیں کروں گا۔ پرامس''اُس نے دانت نکالتے ہوئے کہا تو حور عین نے اُسے غصّے سے گھورا۔

''شکل گم کرو اپنی''اُس نے کہہ کر رخ پھیرا۔

''جانے دو نہ حور دوبارہ نہیں کریگا یہ۔۔۔''ایمان نے سفارش کی۔

''یہ لو میں کان پکڑتا ہوں''مقدّم نے کہا اور حسین کے کان پکڑ لیے۔

''میرے کان کیوں پکڑ رہے ہو؟'' وہ جھنجھلایا۔

''کان تو کان ہی ہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے ہو یا تمہارے؟'' اُسکے جواب پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''چلو! ایک مرتبہ پھر شوٹ کرتے ہیں'' رضا نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے اوکے۔۔۔'' اس مرتبہ شوٹنگ صحیح سلامت ہوگئی۔ رپورٹ پوری ہونے کے بعد حور عین نے سب کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔

''اب اپنی اپنی کلاسز لینے کے بعد کیمسٹری کینٹین میں ملنا'' حور نے کیمرے کو بیگ میں بند کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب کیمسٹری کینٹین؟ ہم مسکن نہیں جا رہے؟'' مقدم نے حیرت سے پوچھا۔ مسکن گیٹ کے اُس پار دو طرفہ طویل شاہراہ تھی، جسکی دونوں جانب مختلف فوڈ چین کے ریسٹورانٹ بنے تھے۔ جامعہ کے طالب علم زیادہ تر یہیں آتے تھے۔

''کس نے کہا ہم مسکن جا رہے ہیں؟ میں تو بس کیمسٹری لے جا کر فرحان کی بریانی کھلانے والی ہوں'' اُس نے مزے سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی غریب ہو'' اُس نے دکھ سے کہا۔ اُسکی اُمیدوں پر بری طرح پانی پھیرا گیا تھا۔

''غریب نہیں مقّی، یہ کنجوس ہے کنجوس۔۔۔'' حسین نے تصیح کی۔

''میرے ماں باپ نے مجھے یونیورسٹی کے باہر ریسٹورونٹ میں بیٹھنے اور کھانا کھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اب لنچ کرنا ہے تو آ جانا ورنہ مرضی تمہاری۔ تم دونوں تو آ رہے ہو نہ؟'' اُس نے پہلے لٹھ مار انداز میں کہا پھر رضا اور ایمان سے پوچھا۔

''یقیناً۔۔۔'' ایمان نے جواب دیا۔

''ہاں چلو، میں وہیں سے ٹرمینل چلا جاؤں گا، آج بائیک نہیں لایا ہوں۔ پوائنٹ سے جانا ہوگا'' رضا کو کیمسٹری کینٹین جانے کا آئیڈیا معقول لگا تھا۔

''اتنی محنت کا یہ صلہ ملا۔۔۔'' مقدّم غائبانہ آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھ چکا تھا۔ ایمان بھی چلنے لگی تھی۔ حور اب بھی ناراض سی تھی اور حسین اُسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ رضا اُنکے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ زندگی ویسی ہی تھی، بے پرواہ اور مطمئن سی۔

لیکن ہمیشہ ایسے رہنے نہیں والی تھی۔۔۔

---------+---------+---------

نہ تو اُسکے کبھی اپنے گھر والوں سے ایسے تعلقات رہے تھے، نہ وہ اتنے دوستانہ مزاج کے حامل تھے کہ وہ اُن سے ایسی بات کرتا۔۔۔

وہ زندگی میں پہلی بار خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ بہن بھائی کوئی بھی تو نہیں تھا، جو اُسکا مقدمہ لڑتا۔ سب ہی سے وہ خود کو دور کر چکا تھا۔ اب سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے بات کرے؟

ایک لڑکی تھی۔۔۔

ایک عام سی لڑکی۔۔۔ لیکن نوید کے لیے خاص ہوگئی تھی۔ اُس سے بمشکل چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ وہ بھی بس نوٹس وغیرہ کے لیے، کبھی کبھار وہ میسیج پر اُس سے کسی خاص موضوع کو سمجھنے کے لیے رابطہ کر لیتی اور بس۔۔۔

لیکن وہ مختلف تھی، باقی لڑکیوں سے بے حد مختلف۔۔۔ یا شاید نوید کو ایسا لگتا تھا۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے خود کو بے حد مصروف کر چکا تھا۔ صبح یونیورسٹی جاتا، دوپہر کو سوپر اسٹور چلا جاتا، جہاں وہ فلور مینیجر تھا۔ رات کو تھک کر جو سوتا تو صبح ہی اٹھتا۔ رشتے داروں سے ملنا جلنا چھوڑ چکا تھا۔ ویک اینڈ پر سی ایس ایس کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتا۔ گو کہ وہ ابھی سی ایس ایس کے لیے رجسٹرڈ نہیں ہوا تھا، لیکن وہ ابھی سے تیاری کر رہا تھا۔

ایسے میں ایک لڑکی کا زندگی میں آنا اور اُسکے لیے اپنے ماں باپ سے بات کرنا اُسے کسی طور آسان نہیں لگ رہا تھا۔ اُس لڑکی سے بات کرنا مشکل نہ تھا۔ اصل مشکل اپنے والدین سے بات کرنا تھا۔

وہ رات بھر سوچتا رہا کہ ماں سے بات کرے یا باپ سے؟ یا بھائی کی مدد لے؟ لیکن ان میں سے کسی سے بھی اُسکے ایسے تعلقات تو نہ تھے۔

اپنی پہلی کمائی اُس نے آدھی اپنی ماں کے ہاتھ پر لا کر رکھی تھی، آدھی تنخواہ وہ اپنی بچت کے پیسوں میں جمع کر رہا تھا جس سے وہ بائیک لینا چاہتا تھا۔ ماں نے اُسکے کمائی کو دوپٹے کے پلو میں باندھتے ہوئے کہا

''اللہ بھلا کرے تمہارے بھائی کا، اُس نے جب کمانا شروع کیا تھا تو پہلی تنخواہ پوری کی پوری میرے ہاتھوں پر لا کر رکھی تھی۔ بس یہی فرق ہے تم میں اور اُس میں'' پہلی بار اُسکا دل بری طرح ٹوٹا تھا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے دل کے ساتھ خاموشی سے وہاں سے اُٹھ گیا۔

اب بھی وہ اپنے ماں باپ کے ممکنہ جوابات سوچ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیسا ردعمل دیں؟ کیا کہیں؟ اُسے طعنہ ماریں؟ یا اُسکا مذاق اڑائیں؟ یا ہمیشہ کی طرح اُسکا موازنہ اُسکے بڑے بھائی سے کریں کہ ''بڑا بھائی زیادہ کماتا ہے، ویل سیٹل ہے لیکن اب تک اس نے اپنے لیے کوئی لڑکی پسند نہ کی اور یہ جمعہ جمعہ چار دن نہیں ہوئے کماتے ہوئے، گھر بسانے کا سوچنے لگے''

اُسے اپنے بہن بھائیوں کا نہیں معلوم، لیکن گھر بسانے کی سب سے زیادہ خواہش اُسکی تھی۔ اُسکے کیریئر اور مستقبل سے بھی اوپر اُسکے لیے اُسکا گھر تھا۔ ایک ایسا گھر جہاں کا ماحول ویسا ہی جیسا وہ اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک ایسا گھر جہاں ویسے ہی لوگ بستے ہوں، جیسے اُس نے اپنی خیالی دنیا میں بسائے ہوئے تھے۔ اُس گھر کی خواہش وہ کب سے اپنے دل میں لیے پھر رہا تھا۔

بی بی اے مکمل ہونے کے بعد اُس نے سب سے پہلے بہت زیادہ ہمت جمع کر کے اپنی ماں سے بات کی، خلاف توقع اور خلاف اُمید اُسکی ماں نے تحمل سے اُسکی بات سنی اور جواب دیا۔

''میں تمہارے باپ سے بات کر کے بتاتی ہوں'' وہ حیران رہ گیا۔ پھر اگلے دن جو ردّعمل اُسکے باپ نے دیا وہ اُس سے بھی کہیں زیادہ خلاف توقع تھا۔ وہ جو سہ سمجھتا تھا کہ اُسکی اس خواہش کا مذاق اڑایا جائے گا۔ ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ جو اُسکے باپ نے کہا تھا وہ اُس سے بھی کہیں زیادہ ڈراونا تھا۔

''میں خود بھی تمہاری شادی کروانا چاہتا ہوں۔ تمہارے دماغ ٹھکانے لگانے کا ایک یہی طریقہ ہے'' اُنہوں نے حسب عادت بے عزتی سے بات شروع کی تھی۔

''لیکن میں بشریٰ سے ہی تمہاری شادی کروں گا'' اُنہوں نے فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ بشریٰ اُنکی بہن اور نوید کی پھوپھو کی بیٹی تھی۔

''ابو! میں بشریٰ سے شادی نہیں کروں گا۔'' اُس نے تحمل سے کہا۔

''تو پھر کسی سے بھی شادی کرنے کے لیے گھر والے ہونا ضروری ہے۔ ہمارے بنا کون ماں باپ تمہیں بیٹی دینگے؟'' وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''ابّو! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں ہمیشہ؟ آپ ایک بار مل تو لیں اُس سے، اچھی لڑکی ہے اور۔۔۔'' وہ پہلی بار بے بسی محسوس کر رہا تھا۔

''ہو گی اچھی، میں نے کب کہا بری ہے۔''اُنہوں نے کندھے اُچکاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''میں تو بس یہ بتا رہا ہوں کہ میں اپنی بہن سے وعدہ کر چکا ہوں، اب اُسکے علاوہ کسی اور کو اپنی بہو نہیں بناؤں گا''

''تو یہ وعدہ پورا کرنے کے لیے میں ہی ہوں؟ بھائی بھی تو ہے''اُس نے دبے دبے غصّے سے کہا۔

''بس، معلوم تھا مجھے جواب یہی آنے والا ہے''کافی دیر سے خاموش بیٹھی اُسکی ماں نے بلند آواز سے کہا تھا۔

''یہ اس حد تک جلتا ہے نا اپنے بھائی سے کہ میں کیا کہوں؟ بھلا کوئی سگے بھائی کہ ساتھ بھی ایسا کرے گا''نوید بھونچکارہ گیا۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ میں تو مسئلہ کا حل بتا رہا ہوں۔''اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''یہ جانتا بھی ہے کہ ہم کل وحید کے لیے اُسکی کو لیگ کا رشتہ لیکر جائینگے، پھر بھی ایسی بات کہہ رہا ہے۔ جان کے، کر رہا ہے یہ سب''ایک اور الزام۔۔۔ہمیشہ کی طرح وہی ٹھہرا تھا مورد الزام۔۔

لیکن دکھ اُسے اس بات کہ تھا کہ اُسکے اپنے سگے بھائی کا رشتہ لیکر کل سب جانے والے تھے اور اُسے خبر بھی نہیں تھی۔۔۔اسی لیے آج صبح سے اُسکی بہن اپنے کپڑے استری کر رہی تھی، اپنے زیورات اور جوتے وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ تو اُسے ہی بے خبر رکھا گیا تھا؟ اُسے اتنا لا تعلق کر دیا گیا تھا کہ بتایا بھی نہیں گیا؟ وہ صدمے اور شدید تکلیف کے عالم میں اُنہیں دیکھ رہا۔

''جب مجھے معلوم ہی نہیں تو میں جان کر ایسا کیوں کہوں گا''اُس نے خود کو وضاحت دیتے ہوئے سنا تھا۔

''اسی گھر میں رہتے ہو، پتہ تو چل ہی گیا ہو گا۔ ورنہ آج ہی کے دن تم یہ بات کرنے کیوں آتے؟ جبکہ کل ہم وحید کا رشتہ لیکر جانے والے ہیں''وہ اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہی تھیں؟ نوید اُس روز ختم ہو گیا تھا۔ ساری خواہشات دل میں دبا کر وہ وہاں سے اُٹھ گیا تھا۔ کمرے میں جاتے ہوئے جو آخری آواز اُس نے سنی تھی وہ اُسکے باپ کی تھی۔

''ہم وحید کے ساتھ ساتھ تمہاری بات بھی بشریٰ سے طے کر دیں گے۔ فضول کے خیالات اپنے دل سے نکال دو۔ ہم ماں باپ ہیں، تمہارا برا نہیں سوچیں گے''

اُس روز کے بعد اُس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ اُسکے بھائی کی بات طے ہو گئی اور تاریخ بھی پکی ہو گئی، وہ مبارک باد بھی دینے نہ گیا۔ بشریٰ سے اُسکی منگنی ہو گئی، اُس نے کسی کو بتایا بھی نہیں۔ اُس نے خود کو زندگی کے حوالے کر دیا تھا۔ جہاں لے جانا چاہے لے جائے۔ البتہ اس نے اپنے اوپر ایک خول چڑھا لیا تھا۔ خوش نظر آنے کا خول۔۔۔

کوئی اُسکے حالات نہ جان جائے، اس خوف سے وہ ہر وقت ہشاش بشاش اور خوش اخلاق نظر آنے کی کوشش کرتا تھا اور کامیاب بھی ہوتا۔

البتہ گھر والوں کے ساتھ اُسکا رویّہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اب اُن سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کرنا چاہتے کرتے رہتے، وہ پوچھتا بھی نہیں تھا۔

اُسکے دوست سمجھتے تھے کہ رضا اپنے خول میں بند ایک پراسرار انسان ہے۔ وہ اُنکے لیے ایک پہیلی کی طرح تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ نوید اُس سے کہیں زیادہ پراسرار اور اُس سے کہیں زیادہ بڑی پہیلی تھا۔

رضا اپنے راز بانٹتا نہیں تھا، لیکن اُسکی شخصیت جس جمود کا شکار تھی، وہ لوگوں کو بتانے کے کی کافی تھی کہ اُس کے اندر کئی راز ہیں۔ لیکن نوید کی ایک سے زائد شخصیت نے کبھی یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنے اندر کیسے کیسے راز رکھے گھوم رہا ہے۔ وہ حالات اور لوگوں کے اعتبار سے اپنی مرضی کی شخصیت کے ڈھانچے میں ڈھل جاتا۔ گھر والوں کے سامنے وہ بدزبان اور نافرمان تھا، رشتے داروں کے سامنے چڑچڑا اور مغرور تھا، دوستوں کے سامنے خوش اخلاق اور خوش مزاج جبکہ آفس والوں کے سامنے اپنے کام سے کام رکھنے والا مگر سنجیدہ اور بردبار۔۔۔

وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھا اور ان الجھنوں کو وقت پر نہ سلجھانے کے وجہ سے وہ اپنی زندگی کو بہت خطرناک موڑ پر لا کھڑا کرنے والا تھا۔ بشریٰ میں اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی، اور کوئی اُسے یہ احساس دلانے والا نہ تھا کہ مستقبل میں وہ پھر سے اپنے ماں باپ جیسا گھر تو نہیں بنانے جا رہا ہے؟

اور رہی بات اُس لڑکی کی، جسے وہ پسند کرتا تھا۔۔۔

اُس سے دوبارہ اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ کبھی جان سکی کہ نوید کے دل میں اُسکے لیے کیا ہے؟

لیکن۔۔۔ بہت جلد وہی لڑکی اُن سب کے درمیان دراڑ کا سبب بننے والی تھی۔ اُسکا اُنکی زندگیوں میں بس اتنا کردار تھا کہ وہ اُن سب کی جدائی کا کردار ادا کرنے والی تھی۔۔۔

اور وہ نوید جس نے اس قصے کو دفنا دیا تھا، اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس بری طرح اُٹھ کر سامنے آئے گا۔

کس بری طرح۔۔۔

---------+---------+---------

اور آج وہ ان سب کے سامنے تھا ایک اور نئی شخصیت کے ساتھ۔۔۔ بے حد سخت اور انجان سا۔۔۔ کسی غیر شناسا سا۔۔۔

"پچھلے ماہ، ایف آئی اے کے سی ٹی ڈی ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھ ایک کیس لگا ہے۔ ایک ایسا کیس جس نے ہماری نیندیں اڑا دی ہیں۔ ہم نے ایک منشیات فروش کو گرفتار کیا تھا اور ہماری توقع کے بلکل برخلاف وہ ایک سیریل کلر نکلا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ فرار ہو چکا ہے۔" فرّخ صاحب نے رک کر اُنکے چہرے دیکھیں۔ وہ سب دم بخود سے اُنہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

"اُس تک پہنچنے کے لیے پچھلے ایک ماہ سے ہم بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ یہ ڈائری اُسی بھاگ دوڑ کا پہلا نتیجہ ہے" اُنہوں نے ڈائری کے صفحات کی تصاویر اپنے سامنے کھولی۔ سکرین پر اب وقتاً فوقتاً مختلف صفحات کی تصاویر سامنے آ رہی تھیں۔

"یہ جتنے بھی لوگوں کی تصویریں آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ ان سب کو قتل کیا جا چکا ہے۔ اور یہ قتل اس طرح سے ہوئے ہیں کہ دنیا کی کوئی عدالت اسے قتل ثابت نہیں کر سکتی" وہ جتنے ٹھنڈے لہجے میں کہہ رہے تھے، اتنے ہی ٹھنڈے پسینے اُنکے ماتھوں اور ہتھیلیوں پر نمودار ہو رہے تھے۔

"ان میں سے کسی نے خودکشی کی، کسی کی موت دوائی بروقت نہ ملنے سے ہوئی، کوئی سمندر میں سرفنگ کرتے ہوئے ڈوب کر مر گیا، کوئی ہائیکنگ کے دوران اپنے اسکواڈ سے پیچھے رہ گیا اور پاؤں پھسلنے سے کھائی میں جا گرا، کسی کی گاڑی کا بریک فیل ہونے پر اُسکی گاڑی درخت سے جا ٹکرائی اور موت کا سبب بنی حتیٰ کہ ایک حاملہ خاتون دورانِ پیدائش چل بسیں" وہ سانس لینے کو رکے۔

''پچھلے دس سالوں سے یہ اور ان جیسی تمام اموات بظاہر حادثاتی یا کسی غفلت کا نتیجہ لگتی رہی تھیں۔ اور ہمیشہ ایسا ہی رہتا اگر ہمیں اُس مائیکل عرف فرمان نامی شخص کے پاس سے یہ ڈائری نہ ملتی''اُنھوں نے سامنے رکھی ڈائری اٹھا کر اُنہیں دکھائی۔

''اس ڈائری نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ تمام لوگ نہ حادثاتی موت مرے تھے اور نہ ہی انکی اموات کسی غفلت کا نتیجہ تھی۔ یہ سب قتل کیے گئے تھے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت، دنیا کی کوئی عدالت ثابت نہیں کر سکتی کہ یہ قتل تھے۔ ہر تصویر کے نیچے ایک تاریخ ہے، اور یہ تمام اموات انہی تاریخوں میں ہوئی ہیں، جو ان تصاویر کے نیچے لکھی ہیں۔'' وہاں بیٹھا ہر شخص دم سادھے اُنہیں سن رہا تھا۔ نوید البتہ اُن سے مستثنیٰ تھا۔ باقی چاروں کو تو اپنے اپنے دماغ ماؤف ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

''اب اسی ڈائری کے آخری صفحے پر تم لوگوں کی تصاویر ہیں۔ اور ان تصاویر کے نیچے تاریخ پانچ مہینے بعد کی ہے''اُنھوں نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا تھا یا اُنہیں اُنکا لہجہ ایسا لگا تھا۔

''مطلب؟''علی نے سن سے لہجے میں پوچھا تھا۔

''مطلب یہ کہ وہ تم چھ لوگوں کو پانچ ماہ بعد قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔''

''کیوں؟''مقدّم نے وہ سوال پوچھا جو سب کے لبوں پر تھا۔

''اس کیوں کا جواب اگر ہمیں معلوم ہوتا تو تم لوگوں کو اس طرح پریشان کیوں کرتے؟ مسئلہ یہی ہے کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم، لیکن ہمیں ہر حال میں جلد از جلد اُس تک پہنچنا ہے۔ اور اُس تک ہمیں آپ لوگ ہی پہنچائیں گے۔ اب سے لیکر اُس مجرم کے پکڑے جانے تک آپ سب کو ہر حال میں ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ ہم جو کہیں وہ ہی کرنا ہو گا'' وہ رکے پھر اُن چاروں کے چہرے دیکھے۔ وہ ابھی بھی شاک کے عالم میں تھے۔

''تم سب پر اور تمہارے ہر قدم پر یقیناً نظر رکھی جا رہی ہے۔ تم لوگ کہاں جاتے ہو؟ کس سے ملتے ہو؟ ہر شے اُنکے علم میں ہے'' بند کمرے میں نوید کی آواز گونجی تھی۔ کتنے عرصے بعد اُن سب نے یہ آواز سنی تھی۔ دس سال کا فاصلہ تھا لیکن وہ آواز آج بھی ویسی ہی تھی ،البتہ وہ ہر دم ہشاش بشاش مسکراتا لہجہ اب انجانی سی سختی لیے ہوا تھا۔

''اگرایسا ہے تو ہمارے یہاں آنے کی خبر بھی ہو گی انہیں، کیا وہ محتاط نہیں ہو جائینگے''اُن سب میں اگر کوئی شخص سب سے پہلے اپنے حواس سنبھالنا جانتا تھا، تو وہ رضا تھا۔ پہلا سوال بھی اُسکی جانب سے ہی آیا تھا۔ اُسکے اس سوال پر شیراز اور فرّخ صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''خبر تو تب ہو گی، جب اُنہیں پتہ ہو گا کہ یہ ایف آئے اے آفس ہے؟'' وہ پر اسرار انداز میں مسکرائے۔

''کیا یہ نہیں ہے؟''اب کہ عمر نے سوال کیا۔

''نہیں! تم سے کس نے کہا کہ یہ ایف آئے اے آفس ہے؟''اُنھوں نے پہلے سے زیادہ پر اسرار لہجے میں سوال کیا تھا۔

''مطلب؟''

''کیا یہاں آتے ہوئے تم لوگوں کو احساس نہیں ہوا کہ تم بس ایک عام سے بنگلے میں قدم رکھ رہے ہو؟''اب وہ سوالات برائے سوالات کر رہے تھے۔

عمر کو کچھ گھنٹے قبل کا منظر یاد آرہا تھا جب وہ ایف آئے اے کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا تھا۔ اُسے علاقے سے کافی دور، اُسکی گاڑی سے اتروا کر، کسی دوسری گاڑی میں بٹھایا گیا تھا اور اُسکی گاڑی کو کوئی اور ڈرائیو کر کے لے گیا تھا۔ ایسا صرف چند سیکنڈز کے اندر اندر ہوا تھا۔ اگر اُسے لے جانے والے لوگ مہذّب اور شائستہ نہ ہوتے تو وہ یقیناً اسے اپنا اغوا ہی سمجھتا۔ وہ لوگ اسے ایک دروازے کے سامنے اُتار کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ

''یہاں سے آپکو آگے خود جانا ہے۔''

وہ دروازہ کیا تھا بس ایک چیک پوسٹ تھی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا اس چیک پوسٹ کو دیکھ رہا تھا، جہاں اُسکے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہیں آرہی تھی۔ اُسکے دل میں خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ جائے لیکن نہ اُسکی گاڑی اُسکے پاس تھی اور نہ ہی موبائل پر نیٹ ورک آرہا تھی۔

''عمر حفیظ۔۔۔''خاموش فضا میں ایک آواز نمودار ہوئی اور وہ جھٹکے سے مڑا۔

''جناب عمر حفیظ! یہ آواز آپ دروازے پر لگے ایئر پیس سے سن رہے ہیں۔ آپ ہمیں نہیں دیکھ سکتے لیکن ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں۔'' عمر نے سر گھما کر یہاں وہاں دیکھا، مگر آس پاس کوئی کیمرہ یا اس جیسی شے موجود نہ تھی۔

''آپ اس دروازے سے اندر داخل ہونگے۔ جب آپ اندر داخل ہونگے، تو دائیں جانب ایک چھوٹی سی مشین ہے۔ آپ نے اپنا سامان بشمول موبائل، اس میں رکھ دینا ہے اور آگے بڑھ جانا ہے۔'' آواز پھر سے آئی۔

''لیکن میں اپنا موبائل کیوں رکھوں؟'' وہ ٹھیک ٹھاک قسم کے شبہات کا شکار ہو رہا تھا۔ اب اُسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اُسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

''آپ فکر نہ کریں، آپکا تمام سامان آپکو واپس کر دیا جائیگا۔ یہ احتیاطی تدابیر کے لیے کیا جا رہا ہے'' اُسے تسلی دی گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُسے ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔ وہ چیک پوسٹ سے گزر کر آگے بڑھا۔ اُسکے دروازے سے گزرنے پر وہاں ''ٹوں'' کی آواز آئی تھی۔

''اب آپ آگے بڑھ جایئے، اور جو سڑک نظر آ رہی ہے اُس سے دائیں مڑ جائیں'' اب کہ وہ خاموشی سے ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ دوسے تین مزید چیک پوسٹوں سے گزرنے پر، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی پاگل ہے، جو ان ہدایات پر عمل کر رہا ہے۔ ہر چیک پوسٹ پر اُسے ایسی ہی ہدایت دی جاتی تھیں۔ قریب تھا کہ وہ غصّے سے پھٹ پڑتا کہ چوتھی چیک پوسٹ پر اُسے اپنا موبائل اور سامان رکھے مل گئے۔

''اب آپ کچھ دیر انتظار کیجیئے۔ ہمارے آدمی آپکو لے جائینگے'' اتنا تو عمر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پورے علاقے میں اُسکے علاوہ کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ ہر طرف بس جنگلات جیسی جھاڑیاں اور درخت ہی درخت تھے۔ یہ علاقہ ویسے بھی شہر سے دور غیر آباد تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک گاڑی آئی اور اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس دفعہ بھی گاڑی میں وہی دو لوگ تھے جو اسے پہلی چیک پوسٹ پر چھوڑ کر گئے تھے۔

''معافی چاہتے ہیں آپکو زحمت ہو رہی ہے۔ لیکن یہ سب آپکی حفاظت کے لیے ہی کیا جا رہا ہے'' گاڑی چلاتے مرد نے معذرت کی۔ اُنکے لباس سادہ سے تھے، لیکن جسامت سے وہ کوئی ایتھلیٹ لگتے تھے، جو اپنی ورزش و جسمانی صحت کا خوب خیال رکھتے ہیں۔

''ہونہہ۔۔۔ میری حفاظت یا اپنی حفاظت؟'' اُس نے دل میں سوچا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

وہ لوگ اسے ایک ایسے علاقے میں لے آئے، جہاں ہر جانب چھوٹے چھوٹے مگر خوبصورت بنگلے بنے تھے۔ اُسکے باوجود بھی قبرستان جیسی خاموشی تھی۔ اُنہوں نے اُسے ایک بنگلے کے سامنے اُتارا جو باہر سے دیکھنے میں عام سا لگتا تھا، جیسے وہاں کوئی چھوٹا موٹا خاندان آباد ہو۔ البتہ جیسے ہی اُسے اندر لایا گیا وہ حیران رہ گیا۔ وہ بنگلہ نہیں بلکہ پورا ایک ادارہ تھا۔ اور اُسکے بعد گول کمرے سے لے کر اب تک جو جو حالات پیش آئے تھے، وہ اُسکے حواس سلب کرنے کے لیے کافی تھے۔ کم و بیش ایسی ہی صورتحال کا سامنا باقی تینوں نے بھی کیا تھا۔

''تم لوگوں کا اگر کسی نے پیچھا کیا بھی ہو گا، تب بھی تمہاری گاڑیوں میں موجود لوگوں نے اُنہیں اب تک بھٹکا دیا ہو گا۔ اُس پر مزید یہ کہ تم چاروں کو الگ الگ راستے سے بلایا گیا تھا۔ تم لوگوں کی گاڑیاں مختلف علاقوں سے لی گئی ہیں۔ تعاقب کرنے والے کبھی مر کر بھی یہ نہیں سوچ سکتے کہ تم سب ایک ہی جگہ آ رہے ہو۔ آگے بھی ایسا ہی ہو گا۔ آج جس جگہ تم لوگ آئے ہو آئندہ یہاں نہیں آؤ گے۔ یہ ہمارا آفس نہیں خفیہ مقام ہے۔ ایسے ہی مختلف خفیہ مقامات پر بریفنگ کے لیے تم لوگوں کو وقتاً فوقتاً بلایا جائیگا۔ اور ہر بار اسی قسم کی احتیاطی تدبیر اختیار کرنی ہو نگی۔'' اُنہوں نے تفصیل سے بتایا۔ عمر کو اب سمجھ آیا تھا کہ یہ سب واقعتاً اُسکی اور باقی سب کی حفاظت کے لیے ہی کیا گیا تھا۔

''فلحال تو مائیکل کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اُسکے مستقبل میں کیے جانے والے قتل کے بارے میں جان چکے ہیں، کیونکہ ہم اُسے صرف منشیات فروشی کے الزام میں تلاش کر رہے ہیں۔ اُس نے یہ ڈائری بہت احتیاط سے چھپا کر رکھی تھی تاکہ کسی کے ہاتھ نہ لگے۔ اور یقیناً وہ اب تک یہی سمجھ رہا ہو گا کہ ہم انجان ہیں۔'' اب کہ نوید بول رہا تھا۔ اُسکا لہجہ مضبوط مگر بے لچک تھا۔

''اور ہم اُسے، اسی غلط فہمی میں رہنے دینا چاہتے ہیں۔ اگر اُسے بھنک بھی پڑی کہ ہم اُسکی کاروائی سے باخبر ہیں تو وہ بنا موقع ضائع کیے قتل کا منصوبہ تبدیل کر سکتا ہے۔ اور ہمیں نہیں معلوم کہ اُسکے ساتھ کتنے لوگ اور ملوث ہیں۔ ان لوگوں تک پہنچنا ضروری ہے، لیکن اُس سے بھی اہم تم سب کی جانوں کی حفاظت ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوں اور تم سب کو کوئی نقصان پہنچائیں۔'' بات فرّخ صاحب نے مکمل کی تھی۔ معاملہ بے حد سنگین تھا۔

''ہمیں کیا کرنا ہو گا؟'' اب کے علی نے سوال کیا تھا۔

''تمہیں وقتاً فوقتاً میری جانب سے ہدایات ملتی رہیں گی۔ ہمارے پاس اُن لوگوں کو بے نقاب کرنے کا پورا منصوبہ ہے اور وقت آنے پر یہ منصوبہ تم سب کے ساتھ شیئر کیا جائیگا۔ البتہ ابھی تم لوگ مجھے یہ بتاؤ گے کہ ماضی یا حال میں تم لوگوں کی کسی سے دشمنی رہی ہو؟ دیکھو

ہمارے لیے اس وقت چھوٹی چھوٹی معلومات بھی اہم ہیں''فرّخ صاحب نے پوچھا۔اُن سب کے چہرے پر ایک ہی جواب تھا **نہیں۔** اُنکی واقعتاً کسی سے کوئی دشمنی تھی نہ کبھی رہی تھی۔

''ابھی ہم میٹنگ یہی تک رکھتے ہیں۔اگلالائحہ عمل کیا ہو گا؟اُس سے جلد تم سب کو آگاہ کر دیا جائیگا۔میری ٹیم ہر وقت تم سب سے رابطے میں رہے گی۔ابھی تم لوگ یہاں سے ویسے ہی جاؤ گے جیسے آئے تھے۔یعنی مختلف راستوں سے،اگلی دفعہ جب تم سب یہاں ہو گے تو مجھے امید ہے کہ حسین مرتضیٰ بھی یہیں ہو گا''سکرین پر حسین کی تصویریں وہ دیکھ چکے تھے۔البتہ وہ یہاں موجود نہیں تھا۔چند ایک مزید معلومات دینے کے بعد فرّخ صاحب نے میٹنگ برخاست کی تھی۔وہ اُنکی ہدایت پر باری باری وہاں سے نکلتے گئے تھے سوائے نوید کے،وہ ویسے ہی ٹانگ پر ٹانگ جمائے لاتعلق سا بیٹھا تھا۔اُنکے وہاں سے جانے کے بعد فرّخ صاحب نے اُسکی جانب دیکھا۔وہ کسی غیر مرئی نکتے پر نِگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔

''کیا تم اپنے دوستوں سے ملنا نہیں چاہتے؟''

'' وہ میرے دوست نہیں ہیں''بے تاثر سے چہرے کے ساتھ جواب آیا۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ یہ آپ سب کا کوئی مشترکہ دشمن ہے''پوری بریفنگ کے دوران خاموش کھڑے شیراز نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

''اس نہج پر ہم پہلے ہی سوچ چکے ہیں،پچھلے دس سالوں سے ہم نے ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھا تو ہمارا کوئی مشترکہ دشمن کیسے ہو سکتا ہے؟''نوید جھلّا گیا۔

''دس سال پہلے بھی تو ہو سکتا ہے نہ؟''سکرین کی طرف نِگاہیں مرکوز کیے شیراز نے آہستہ آواز میں کہا تھا۔نوید ساکت ہوا۔اُسکی آنکھوں میں پہلے الجھن،پھر شاک اور پھر بے یقینی کی کیفیت نظر آئی تھی۔شیراز نے سکرین سے نظریں ہٹا کر اُسکی جانب کی۔اس پوری گفتگو کو سنجیدگی سے سنتے فرّخ صاحب اور نوید کی جانب رخ بدلتے شیراز نے بڑے غور سے اُسکے چہرے کے پل پل بدلتے رنگوں کو دیکھا تھا۔

''عاصم۔۔۔؟''اُس نے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس کی تھی۔

''لیکن وہ مر گیا تھا''اُس نے خود ہی اپنی بات کی نفی کی تھی۔

''مرا نہیں تھا، مردہ پایا گیا تھا''فرّخ صاحب بھی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''کیا فرق پڑتا ہے؟اس بات کو دس سال ہو چکے ہیں۔''نوید اس بات کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''لیکن اُسے مارنے والا تو زندہ ہے نا؟''شیراز کسی اور نہج پر سوچ رہا تھا۔

''عاصم۔۔ عاصم مراد۔۔۔ کس نے مارا تھا اُسے، اور کون تھا اُسکے ساتھ؟ اور کون؟'' وہ زیر لب دھرا رہا تھا۔ فرّخ صاحب شیراز ڈیپارٹمنٹ سے عاصم کے کیس کو نکلوانے کا کہہ رہے تھے۔ شیراز سر ہلاتے ہوئے اُنکی بات سن رہا تھا۔ البتہ نوید اس شاک سے ابھی بھی باہر نہیں آسکا تھا۔

''ایس ایس پی نوید! کیا تم ٹھیک ہو؟''فرّخ صاحب نے اُسے سن سا بیٹھا دیکھ کر پوچھا تھا۔

''ا۔۔۔ ہاں''اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔''کیا میں جا سکتا ہوں؟''اُس نے اجازت چاہی۔

''بلکل۔۔''اُنہوں نے اُسے اجازت دی تو وہ جھٹکے سے اٹھتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہ گئے تھے۔

---------+---------+---------

چودھویں کی رات تھی، ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں سیاہ جینس پر سفید پولو ٹی شرٹ پہنے اور اُس پر کالی جیکٹ ڈالے، جسکی زپ سینے سے تھوڑا نیچے تک بند تھی، ہلکے سفید اور سیاہ بالوں والا نوید بھی اسی منظر کا حصہ لگ رہا تھا۔ خاموش گہری مگر روشن رات میں وہ مضبوط قدم اٹھائے تیز تیز آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس نے دو گلیاں پار کی اور پھر سڑک پر آگیا۔ سڑک پر ایک آدھ گاڑیاں بمشکل نظر آجاتی تھیں۔ اسٹریٹس لائٹ کھلی ہونے کی وجہ سے اب نوید کا چہرہ واضح نظر آرہا تھا۔ ہمہ وقت سخت اور سنجیدہ نظر آنے والے چہرے پر اس وقت فکر مندی چھائی ہوئی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب قبرستان تھا۔ اور وہی اُسکی منزل تھی۔

سڑک پار کر کے وہ قبرستان میں آگیا۔ باہر کی نسبت یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ بہت زیادہ درخت ہونے کی وجہ سے چاند کی روشنی بھی اسے روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ متلاشی نظروں سے یہاں وہاں دیکھتا وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ بلآخر وہ اپنی مطلوبہ قبر پر پہنچ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح وہیں تھی، دو قبروں کے درمیان بیٹھی ایک قبر پر سر ٹکائے اور دوسری قبر ہاتھ پھیرتی ہوئی۔

اُسکی متاعِ حیات۔۔اُسکی بشریٰ۔۔۔

نوید نہ تو اُسکی زندگی میں **نوید** بن کر آیا تھا اور نہ ہی بشریٰ اُسکے لیے **بشریٰ** ثابت ہوئی تھی۔

---------+---------+---------

''ڈرو مت! امی آپکو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی'' بشریٰ قبر پر سر ٹکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اُسکے کپڑے مٹّی مٹّی ہو چکے تھے۔

''میں آپ دونوں کے پاس ہی رہوں گی۔ اپنے پیارے بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب رونا مت ٹھیک ہے۔۔۔ میں نظم سناتی ہوں اور تم دونوں سو جانا'' وہ کہتی جارہی تھی۔ پھر اُس نے ہلکی آواز میں نظم پڑھنی شروع کی۔ قبرستان کی موت جیسی خاموشی میں اُسکی سریلی آواز مزید ہیبت پیدا کررہی تھی۔ ناجانے وہ کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہتی، جب کسی نے اُسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نوید اُسکے برابر میں ہی بیٹھا تھا۔

''بشریٰ۔۔۔'' نوید نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُکارا۔

''ھش۔۔۔ آہستہ بولو۔ دونوں ابھی سوئے ہیں۔ اُٹھ جائینگے تمہاری آواز سے'' اُس نے خفا انداز میں کہا۔ اور دوبارہ سے قبر کو سہلانے لگی۔ اُس کے بال گردآلود ہو رہے تھے۔

''چلو گھر چلتے ہیں'' اُس نے اُسکے بالوں سے آہستہ سے مٹّی جھاڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔'' وہ سختی سے بولی۔

''اب میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ دونوں رات کو ڈر جاتے ہیں'' اُس نے نروٹھے انداز میں کہا۔

''تم نے ابھی تو کہا کہ دونوں سو گئے ہیں، جب سو گئے ہیں تو اب صبح ہی اٹھیں گے۔ تمہیں یہاں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے'' اُس نے پیار سے اُسے سمجھایا۔ چاند کی روشنی میں اُسکا چہرہ واضح تھا، آنکھوں کے کناروں پر لگا وہ نشان اُسکے چہرے کے خدوخال کا حصہ لگتا تھا۔ چہرے پر ہر لمحے چھائی سختی اس وقت نرمی میں بدل چکی تھی۔

''ہاں لیکن۔۔۔'' اُسے خود نہیں سمجھ آیا کہ کیا کہے۔

’’میں نہیں جاؤں گی، بس۔۔ نہیں جاؤں گی‘‘اُس نے ضدی لہجے میں کہااور دوبارہ قبر سے سر ٹکادیا۔

’’ٹھیک ہے مت جاؤ، لیکن گھر میں جو تمہارے دواور بچے ہیں۔ وہ کیسے رہیں گے ؟اُنہیں بھول گئی تم؟‘‘نوید اب دونوں گھٹنوں پر بازو ٹکائے فرصت سے وہیں بیٹھ گیا تھا۔اُسکی اس بات پر بشریٰ نے دوبارہ سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

’’اُنکے پاس تم چلے جاؤ‘‘اُس نے حل پیش کیا۔

’’لیکن وہ تو تمہارے بنا نہیں سوتے۔‘‘

’’لیکن۔۔‘‘اُس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

’’لیکن ویکن کچھ نہیں، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میری اجازت کے بنا یہاں نہیں آؤ گی، لیکن تم آئی۔ وعدہ توڑا تم نے اپنا۔‘‘ وہ لہجے میں سختی سمونے کی کوشش کرتا ناکام ہوا تھا۔ لیکن بشریٰ پھر بھی شرمندہ ہوئی۔

’’اب اگر تم میرے ساتھ گھر نہیں گئی تو میں کل دوبارہ تمہیں یہاں نہیں لاؤں گا‘‘ وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بھی چند لمحے اُسے دیکھتی رہی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔ پھر قبروں کو دیکھا اور بولی

’’میں جا رہی ہوں کیونکہ آپکے ابو غصّہ کر رہے ہیں۔ پریشان مت ہونا میں کل دوبارہ آؤں گی۔ ٹھیک ہے؟‘‘اُس نے کہتے ہوئے مدد طلب نظروں سے نوید کو دیکھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا تو وہ اُسے تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوید نے ایک مرتبہ پھر اُسکے بالوں سے گرد جھاڑی اور اُسکا دوپٹہ سر پے جماتے ہوئے اُسے لیکر آگے بڑھنے لگا۔

’’دونوں نے کھانا کھالیا تھا؟‘‘اب کے اُسے گھر میں موجود اپنے دونوں بچوں کی فکر ہوئی۔

’’بڑی مشکلوں سے کھایا تھا، تمہارے بنا نہیں رہتے پتہ تو ہے‘‘ وہ بتانے لگا۔ جواب میں بشریٰ کچھ کہہ رہی تھی۔ اسی طرح اُسے باتوں میں لگائے وہ قبرستان سے جیسے ہی باہر آیا۔ اُسے سامنے ہی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے، نظریں جھکائے کھڑا وحید دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر نوید رکا۔

''بھائی؟۔۔۔''اُس نے حیرت سے وحید کو پکارا، تواس نے چہرہ اٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر سیدھا ہوا۔ نوید کچھ بھی کہے بنا گاڑی تک آیا۔ وحید نے آگے بڑھ کر پیچھے کا دروازہ کھولا تو اُس نے پہلے بشریٰ کو بٹھایا اور پھر خود بھی پیچھے ہی بیٹھ گیا۔ وحید نے دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

پانچ منٹ بعد ہی وہ نوید کے گھر کے سامنے تھے۔ دورانِ سفر اُنکے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ گاہے بگاہے وحید بیک ویو مرر میں نظر آتے نوید کو دیکھ لیتا، جسکی نظریں کھڑکی سے سر ٹکائے باہر جھانکتی بشریٰ پر ہوتی تھیں۔ گھر پہنچ کر نوید نے بشریٰ کو گاڑی سے اتارا تو وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اندر آتے ہی اُس نے اپنے بچوں کے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیئے، وہاں جو دیکھا تو دونوں اپنے اپنے بستر پر سو رہے تھے۔ اُس نے باری باری دونوں کا ماتھا چوما۔

''سوری بیٹا!''اُس نے آہستہ سے کہا۔ پھر دروازے کی جانب دیکھا، جہاں دروازے کے قبضے سے ٹیک لگائے، دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑا نوید، اُسی کو دیکھ رہا تھا۔

''میں یہیں سو جاؤں؟''اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، لیکن رات کو اُٹھ کے کہیں جانا مت''اُس نے اجازت دینے کے ساتھ ساتھ تنبیہہ بھی کی تھی۔ بشریٰ اپنے چھوٹے بیٹے کے بستر پر اُسکے برابر میں جا کر لیٹ چکی تھی۔

نوید نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور لاؤنج میں چلا آیا جہاں وحید خاموش بیٹھا کب سے یہ تمام کاروائی دیکھ رہا تھا۔ نوید اُسکے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا۔ کافی دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔ نوید صوفے کی میز پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا اور وحید اُس پر۔۔۔

''کیسی حالت ہے اب اُسکی؟''خاموشی میں وحید کی آواز گونجی تھی۔

''ویسی ہی ہے''مختصر سا جواب دیا۔

''کوئی بہتری نہیں آئی؟''

''آئی ہے''اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا، نِگاہیں اب بھی میز پر ہی تھیں۔

”پہلے کمرے میں بند رہتی تھی، اب گھر کے کاموں اور دیگر چیزوں میں توجہ دینے لگی ہے۔ قبرستان جانا بھی کم کر دیا ہے، لیکن ختم نہیں ہوا۔ گھر میں بچوں کے ساتھ ہوتی ہے تو اُسے قبرستان بھول جاتا ہے۔ قبرستان جاتی ہے تو یہ بھول جاتی ہے کہ گھر میں بھی اُسکے دو بچے ہیں“ پہلی بار اُس نے تفصیلاً جواب دیا تھا۔ اب کہ وحید خاموش ہی رہا۔ خاموشی کا یہ وقفہ کافی طویل ہو گیا تھا۔ دونوں اپنی پہلے والی پوزیشن میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”آپ کیسے آئے؟“ اس بار نوید نے خاموشی کو توڑا تھا۔

”مائیکل والے کیس کی اطلاع ملی مجھے۔ تم سے تصدیق کرنے آیا تھا۔ گھر پر نہیں ملے تو قبرستان چلا آیا“ اُس نے بنا کسی تمہید کے کہا۔

”سچ ہے“ اُس نے تصدیق کر دی۔ وحید کے گلے میں گلٹی اُبھر کر معدوم ہوئی۔

”تمہیں احتیاط کرنی چاہیے“ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

”میرے لیے معمول کی بات ہے“ اُس نے مشورہ رد کیا تھا۔ دونوں کے درمیان دوبارہ خاموشی چھا گئی تھی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئے۔ وحید کی سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے تو اُٹھ کھڑا ہوا۔

”میں چلتا ہوں۔ میری اگلی پوسٹنگ نارووال میں ہے، کل چلا جاؤں گا صبح۔“

”نارووال میں کب تک کے لیے؟“ نوید نے اُسکے ساتھ ہی کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا، آنکھ کے برابر زخم کے نشان پر درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

”ایک آپریشن ہے، واپسی اُسکے مکمل ہونے پر ہی منحصر ہے۔“ اُس نے گھر سے باہر آتے ہوئے کہا۔ گاڑی تک پہنچ کر وہ نوید کی جانب مڑا جو اُسکے ساتھ ساتھ باہر آیا تھا، پھر بولا

”کوئی ضرورت ہو تو بتانا“ نوید نے بس سر ہلا دیا، جاتے ہوئے اُس نے نوید کا گال تھپتھپایا اور کہا

”اپنا خیال رکھنا“

پھر جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔ نوید خاموشی سے اُسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔ وہ تو اسے خیال رکھنے کو بھی نہ کہہ سکا تھا۔

اُسکے جانے کے بعد بھی وہ ایسے ہی کھڑا رہا تھا۔ دن بھر کے واقعات دماغ میں گھوم رہے تھے۔

تم سب کا مشترکہ دشمن

"عاصم۔۔۔" اُس نے زیر لب دہرایا۔

میں تم سب سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا آج نہیں تو کسی اور وقت پر، مگر چھوڑوں گا نہیں ایسے۔۔۔

مرنے سے پہلے عاصم کے کہے گئے الفاظ اُسکے کانوں میں گونجے۔

"عاصم مر چکا ہے۔۔" اُس نے ایک بار پھر خود کو تسلی دی۔

لیکن اُسے مارنے والا تو زندہ ہے نہ؟

شیراز کے الفاظ اُسکے ہر طرف گھوم رہے تھے۔ سر کا درد بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

---------+---------+---------

(جاری ہے)

نحل کی چوتھی قسط ستمبر کی پندرہ تاریخ کو میری ویبسائٹ اور پیج پر شائع ہو گئی انشاءاللہ